جلد : ۳ | شمارہ : ۷

محرم الحرام ۱۳۸۸ھ — اپریل ۱۹۶۸ء

مدیر

سمیع الحق

اس شمارے میں

★

بدل اشتراک

مغربی پاکستان	مشرقی پاکستان
سالانہ چھ روپے	سالانہ بذریعہ ہوائی ڈاک آٹھ روپے
فی پرچہ ۵۶ پیسے	فی پرچہ ۶۲ پیسے

غیر ممالک سالانہ ایک پونڈ

سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ طابع و ناشر نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا

نقش آغاز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پچھلے ماہ راقم کو وطنِ عزیز کے مشرقی حصہ مشرقی پاکستان جانے اور آٹھ دس دن تک وہاں کے مسلمان بھائیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ڈھاکہ کے چند اہل خیر اور دینی درد رکھنے والے حضرات (جن میں حاجی بشیر الدین بوگرہ اور ان کی فرم جمیل الدین لمیٹڈ پیش پیش تھے) کی خواہش تھی کہ ملک کے مغربی حصہ کے علماء اور اکابر یہاں تشریف لاکر مسلمانوں کو اپنے خیالات سے محظوظ کریں، اس خواہش میں یہ جذبہ بھی شامل تھا کہ دونوں حصوں کے اہلِ علم کا باہمی تعاون ہو اور یہاں کے دینی عواطف، ملی احساسات اور جذبات کا مشاہدہ بھی ان علماء کو ہو سکے۔ دینی جذبات سے معمور ان حضرات نے تعلیم القرآن سوسائٹی کے نام سے ایک خالص قومی تبلیغی ادارہ قائم کیا ہے۔ اور اس انجمن کی طرف سے انہوں نے قرآنی تعلیمات پر اجتماعات کا پروگرام بنایا اور مشرقی و مغربی پاکستان کے چند علماء کو دعوت دی چنانچہ اس دعوت پر مغربی پاکستان سے حضرت مولانا شمس الحق افغانی مدظلہ، شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ، مولانا عبید اللہ انور انجمن خدام الدین لاہور، مولانا حامد میاں صاحب مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور، مولانا مجاہد الحسینی لائل پور، مولانا عبدالقادر آزاد بہاولپور ــــ ۲۲ر فروری کو ڈھاکہ تشریف لے گئے مدعوین میں سے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ اور حضرت مولانا محمد یوسف بنوری مدظلہ کراچی بوجہ سفرِ حج یہ دعوت قبول نہ کر سکے۔ وہاں کے بعض مخلص احباب نے ایک طالب العلم کی حوصلہ افزائی کے طور پر ناچیز کو بھی دعوت دی اور بطور ادنیٰ خادم کے مجھے اس سفر میں دینی اجتماعات کی شمولیت، حضرات اکابر کی رفاقت، اور وہاں کے اہلِ علم، دینی اداروں اور پہلی بار وطنِ عزیز کے ایک مردم خیز، زرخیز، دینی احساسات اور سیاسی بیداری سے مالامال خطہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس مختصر دورہ میں ہر جگہ ان حضرات نے اپنے گہرے نقوش اور اثرات چھوڑے، حضرت علامہ افغانی کی علمی شخصیت اسلام کے نشأۃ ثانیہ اور اتحاد بین المسلمین پر انکی پُرمغز تقاریر، حضرت مولانا انور کی بے مثال تواضع، کریمانہ اخلاق، مولانا حامد میاں صاحب کی پُروقار شخصیت، مولانا مجاہد الحسینی کا سیاسی شعور اور آزاد صاحب کی شعلہ بیانی سے ہر جگہ لوگوں نے گہرا اثر لیا ــــ تعلیم القرآن سوسائٹی کے فعال اور سرگرم کارکن مولانا محی الدین خان صاحب کی رفاقت اور مدبرانہ رہنمائی پورے سفر میں حاصل رہی اس سفر میں وہاں کی دینی، سیاسی اور اقتصادی زندگی کے جو گوشے کچھ نہ کچھ سامنے آئے، ان مشاہدات اور تاثرات کی یہاں گنجائش نہیں۔ سفر کا مختصر حال یہ ہے کہ ۲۳ اور ۲۴ فروری کو سوسائٹی کے

زیر اہتمام ڈھاکہ کی وسیع اور پرشکوہ جامع مسجد بیت المکرم میں عام اجتماعات ہوتے، علماء کرام نے اردو اور بنگلہ میں قرآن کریم کے مختلف پہلوؤں اور مسلمانوں کی موجودہ حالت پر روشنی ڈالی ان اجتماعات میں ڈھاکہ کے لوگوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ ۲۵ر فروری کی ظہر کو ڈھاکہ کے سب سے بڑے آڈیٹوریم انجینئرنگ انسٹی ٹیوٹ ہال میں اجتماع ہوا جس میں ڈھاکہ کے معززین شرفاء اور فہمیدہ حضرات مدعو تھے۔ اس مجلس میں قرآن کریم پر کچھ مقالے پڑھے گئے اور چند تقریریں ہوئیں۔ ان ہی ایام میں ڈھاکہ کے کئی علمی اور دینی اداروں میں بھی ان کے منتظمین کی خواہش پر جانا ہوا۔ مدرسہ اشرف العلوم، جامعہ قرآنیہ لال باغ، مدرسہ امداد العلوم، ادارہ المعارف جو ڈھاکہ جیسے مرکزی شہر کے علمی اور دینی مراکز ہیں اور ہر لحاظ سے مرکز کے شایان شان اور اس خطہ کی دینی روایات کے آئینہ دار ہیں۔ ان اداروں میں استقبالیہ تقریبات ہوئیں، اساتذہ و طلبا اور منتظمین نے نہایت خلوص اور محبت کا مظاہرہ کیا، اور تقریباً ہر ادارہ میں حضرت شیخ الحدیث اور حضرت افغانی صاحب نے خطاب فرمایا۔ مشرقی پاکستان کے دیگر علاقوں سے بعض مدارس عربیہ، اور دینی ملی اداروں اور اہل علم حضرات نے تعلیم القرآن سوسائٹی کی وساطت سے ان حضرات کی زیارت اور ان کے خیالات سے مستفید ہونے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ چنانچہ ڈھاکہ کے سہ روزہ پروگرام کے بعد ۲۶ر تاریخ کو بذریعہ ٹرین میمن سنگھ جانا ہوا۔ مولانا فیض الرحمان صاحب جو پورے ضلع میں اثر و رسوخ اور دینی اعتماد رکھنے والے بزرگ ہیں، نے جلسے کا انتظام فرمایا تھا۔ راستے میں اور پھر میمن سنگھ میں مسلمانوں کی محبت اور علماء سے گرویدگی قابل دید تھی۔ ظہر کے بعد شہر کی جامع مسجد میں جلسہ عام تھا، سامعین کا ایک سیلاب تھا جو دور دراز سے اُمڈ آیا تھا — اندازاً تیس چالیس ہزار کا مجمع تھا جو عشاء تک پورے اطمینان سے جارہا۔ یہاں تھوڑی دیر کیلئے مولانا نور الدین صاحب کی دعوت پر مہمانوں کو دارالعلوم میمن سنگھ بھی جانا ہوا۔ اور مدرسہ کے نظم و نسق سے سب متاثر ہوئے۔ رات کو میمن سنگھ سے ڈھاکہ واپس ہوئے۔ ۲۷ر کی صبح کو بذریعہ طیارہ ڈھاکہ سے سلہٹ جانا ہوا۔ سلہٹ بنگال میں اپنے وقت کے سرتاج اولیا حضرت شاہ جلال مجرد یمنیؒ کا مدفن اور قریبی زمانہ میں تقریباً نصف صدی تک قطب وقت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کی خصوصی توجہات اور عنایات کا مرکز رہا ہے۔ حضرتؒ کی مسیحائی کے اثرات چپہ چپہ سے نمایاں ہیں۔ اہل علم اور اکابر دیوبند سے گرویدگی اور مہمانوں سے جو محبت یہاں دیکھنے میں آئی وہ بے نظیر تھی۔ ہوائی اڈا پر استقبال کرنے والے بے شمار لوگوں میں حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے کئی خلفاء اجل بھی جمعیۃ العلماء اسلام مشرقی پاکستان کے امیر حضرت مولانا شیخ عبدالکریم کی سرکردگی میں موجود تھے۔ یہاں کی جمعیۃ بڑی فعال

منظم اور سرگرم ہے۔ ہوائی اڈہ سے شہر تک چھ میل کا طویل راستہ ان اکابر کے متعلق ترحیبی نعروں، "اسلام" اور جمعیۃ العلماء اسلام زندہ باد" اور اسلامی آئین کے مطالبوں سے گونج اٹھا۔

جس علم دوست بزرگ کے مکان پر قیام تھا۔ ایم سلیمان خان صاحب، حضرت شیخ مدنیؒ کے دیرینہ خدام اور عشاق میں سے تھے اور ان کا وجود اصلاحِ نفس و تزکیۂ اخلاق میں حضرت مدنیؒ کا یدِطولیٰ رکھنے کا بیّن ثبوت تھا۔ دنیاوی وجاہت اور ثروت بیشمار حشم و خدم کے ہوتے ہوئے وہ اپنے ہاتھوں سے علماء کے لئے کھانا تیار کر رہے تھے اور سارا خاندان بچھا جا رہا تھا جس کو دیکھ کر من تواضع للہ رفعہ اللہ۔ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا، ظہر کی نماز حضرت شاہ جلال یمنیؒ کی مسجد میں پڑھی گئی اور تھوڑی دیر کیلئے درگاہ سے ملحق مدرسہ کی دعوت پر مدرسہ میں بھی جانا ہوا۔ تین بجے جمعیۃ العلماء کی طرف سے حضرت مولانا الشیخ عبدالکریم صاحب امیر جمعیۃ کی صدارت میں سارودھا ہال میں جلسۂ عام شروع ہوا۔ اجتماع کا یہ عالم تھا کہ آغاز جلسہ سے پہلے ہی ہال کی دونوں منزلیں کھچا کھچ بھر گئی تھیں، اور باہر احاطہ میں لوگوں کے ہجوم میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے بے چینی اور اضطراب میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ چنانچہ منتظمین کو جلسہ ہال سے باہر میدان میں منتقل کرنا پڑا۔ جمعیۃ العلماء اور دینی مدارس کی طرف سے علماء نے سپاسنامے پیش کئے۔ جلسہ میں اکثریت اہل علم، مشائخ اور دیندار لوگوں کی تھی چنانچہ یہاں علماء کرام کے باہمی ضبط و تنظیم کی ضرورت اور اہمیت پر بھی تقریریں ہوئیں۔ جلسہ شام کی نماز تک جاری رہا۔ شام کی نماز ہم نے نئی سڑک کی اس تاریخی مسجد میں ادا کی جہاں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ ۳۰۔۳۵ سال تک تعطیلاتِ رمضان میں قیام فرماتے اور "ارضِ بنگالہ" کے تشنگانِ رشد و ہدایت کو معارفِ ربانی اور اپنے انفاسِ قدسیہ سے سیرابی بخشتے۔ حضرت شیخؒ کی نسبت سے اس مسجد اور ملحقہ حجرہ مبارکہ اس کی سادگی اور ماحول نے ایک عجیب سماں باندھا اور حضرت کے لاثانی ایثار راہِ خدا میں قربانی، جفاکشی اور اصلاح خلق کے لئے بے مثال جد و جہد اور ریاضت کے انمٹ نقوش دل و دماغ پر ابھرے اور بقدرِ عقیدت اور نسبت ہر ایک کے جذبات میں ایک عجیب تلاطم برپا کر گئے، یہاں کے در و دیوار سے عشق اور فنائیت کی بو محسوس ہوئی۔ شاید شاعر نے ایسے ہی موقع پر کہا ہو ؎

بہر زمین کہ نسیمے ز زلف او زدہ است
ہنوز از سرِ آں بوئے عشق می آید

یہاں کے سبزہ زاروں اور گھنے جنگلات میں بلبل چہک رہے تھے، جیسے بول رہے ہوں کہ ؎

یہ وہ وادی ہے اے ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

سلہٹ کے مختصر قیام میں خلوص و محبت کی بے حساب یادیں اپنے ساتھ لیکر نگاہِ حسرت (جو ابھی سیر کہاں ہوئی تھی) ڈالتے ہوئے رات کو بذریعہ ٹرین چٹاگانگ روانہ ہوئے۔ محبین، مخلصین اور بزرگوں نے جس شوق اور ولولہ سے پذیرائی کی تھی ویسے ہی جذبات محبت سے الوداع کہا۔

۲۸ر کی صبح کو ہم چٹاگانگ پہنچے۔ مشرقی پاکستان کے مقتدر اور صاحب خیر بزرگ حاجی بشیر الدین بوگرہ کی فرم جمیل الدین لیمیٹڈ کے ہاں قدرے قیام کیا۔ چاٹگام کے مضافاتی علاقوں میں یہاں کے دو عظیم الشان مدارس مدرسہ معین الاسلام ہاٹ ہزاری اور مدرسہ ضمیریہ پٹیہ دیکھنے گئے، ہر دو مدرسے یہاں کے مسلمانوں کے دینی علوم سے شغف کے زندہ نمونے ہیں۔ اوّل الذکر میں تو بارہ سو تک طلبہ زیرِ تعلیم ہیں۔ دیگر مدارس میں بھی طلبہ کی تعداد ۵، ۶ سو کے لگ بھگ رہتی ہے۔ برمی سرحدات یہاں سے قریب ہونے کی وجہ سے کئی برمی طلبہ بھی یہاں تعلیم پاتے ہیں۔ ڈھاکہ، میمن سنگھ، سلہٹ کی طرح یہاں کے مدارس کے کئی اساتذہ اور اکثر علماء حضرت افغانی اور حضرت شیخ الحدیث صاحب سے ان کے زمانۂ تدریس دارالعلوم دیوبند میں تلمذ حاصل کر چکے تھے۔ ۲۰، ۲۵ سال بعد اپنے اساتذہ سے ملاقات ان حضرات کو عجیب نعمت محسوس ہوئی۔ ہر دو مدارس میں جو چٹاگانگ کی مختلف سمتوں پر واقع ہیں، مختصر استقبالیہ جلسے ہوئے، درسِ بخاری کے علاوہ تقریریں ہوئیں۔ نمازِ مغرب کے بعد چٹاگانگ شہر کے تجارتی علاقہ کے وسط میں مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال کے وسیع لان میں جلسۂ عام کا انتظام تھا۔ جناب رضاء الکریم صاحب پرنسپل سٹی کالج چاٹگام کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا۔ رات گئے تک اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کی دینی زندگی اور پیش آمدہ مسائل پر تقریریں ہوئیں دیگر مقامات کیطرح یہاں بھی اردو تقاریر کا خلاصہ بنگلہ زبان میں سنایا گیا خود صدر جلسہ نے یہ ترجمانی بہترین طریقہ سے کی۔ ۲۹ر فروری کی ظہر کو سب حضرات ڈھاکہ واپس پہنچے واپسی میں ڈھاکہ کے مشہور خواجہ خاندان کی خواہش پر ان کے ہاں احسن منزل نواب باڑی میں قیام رہا۔ اہل علم بالخصوص اکابر دیوبند کے ساتھ اس خاندان کا والہانہ تعلق ہے۔ برصغیر کی مشہور شخصیتوں میں سے حضرت مدنیؒ، حضرت تھانویؒ مولانا آزادؒ اور دیگر اکابر کا شرفِ میزبانی اس مکان کو حاصل ہے۔ نواب خواجہ انیس اللہ صاحب اور ان کے تمام خویش واقارب انکساری، خلوص اور محبت کے پیکر ہیں۔ خواجہ ناظم الدین صاحب مرحوم اسی خاندان کے ایک فرد تھے۔ دیگر حضرات یکم مارچ کو ڈھاکہ سے لاہور واپس ہوئے اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ خواجہ برادری کے اصرار پر دو دن مزید ان کے ہاں ٹھہرے۔

مشرقی پاکستان اولیاء اللہ اور بزرگوں کی سرزمین ہے۔ ۲ر مارچ کو ڈھاکہ کی مضافاتی آبادی میر پور میں حضرت شاہ علی بغدادیؒ کے مزار کی زیارت کی نیز ڈھاکہ سے تیس میل دور قدیم دارالخلافہ

"سنار گاؤں" بھی گئے۔ یہاں کے قدیم اور بوسیدہ کھنڈرات میں کئی اولیاء اللہ محو استراحت ہیں۔ آبادی سے کچھ دور سلطان غیاث الدین بلبن کا مزار ہے۔ سنار گاؤں میں حضرت شاہ شمس الدین ابو توامہؒ حضرت مخدوم شرف الدین منیری کی اہلیہ محترمہؒ حضرت ابراہیم دانشمندؒ حضرت یوسف دانشمندؒ حضرت شاہ کامل شاہؒ اور دیگر بزرگوں کے مزارات پر فاتحہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ ۳۰ مارچ کو بوقت ظہر ڈھاکہ سے روانہ ہو کر عصر سے قبل لاہور پہنچے، اس پورے سفر میں جس چیز نے سب کو بے حد متاثر کیا وہ یہاں کے عام مسلمانوں کا دینی جذبہ، اسلام سے گرویدگی اور تعلق تھا۔ مساجد، مدارس اور علماء کی اتنی کثرت بمشکل دوسرے علاقوں میں ہوگی، بعض حضرات نے بتلایا کہ صرف مسلک دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء کی تعداد ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ اگر یہ طاقت منظم اور مربوط ہو کر زیادہ جوش وخروش سے دینی میدانوں میں اترے تو ساری دینی مشکلات ختم ہو سکتی ہیں۔ لوگوں کے دینی ذوق وشوق اور ولولہ کا نتیجہ تھا کہ اردو نہ سمجھنے والے بھی گھنٹوں سکون اور عقیدت سے جلسوں میں بیٹھے رہتے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں باہمی تعاون اتحاد اور مکمل یگانگت کی ضرورت پر مشتمل تقریریں بھی ان لوگوں نے بڑی دلجمعی سے سنیں، جبکہ یہاں یہ چیز مادی یا سیاسی مقاصد پر استوار تقریبات میں دیکھنے میں نہیں آتی جس سے یہ حقیقت اور بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس ملک کا اتحاد، استحکام اور باہمی ربط و تعلق صرف اور صرف اسلام، اسلامی اقدار اور دینی روابط ہی کے ذریعہ ممکن ہے اور یہ چیز تب حاصل ہوگی کہ مرکزی قوت خود اس لحاظ سے اپنی ذمہ داری محسوس کرے۔ جو تعلق عقیدہ پر مبنی ہو اس کی جڑیں دلوں کے اندر جاگزیں ہوتی ہیں۔ دیگر امور، ذرائع اور وسائل سے استحکام کی کوششیں دونوں ملکوں کے مواصلاتی نظام کی طرح نقش بر ہوا یا نقش بر آب ثابت ہو سکتی ہیں۔ فانی رشتے فانی اور تغیر پذیر ہیں۔ اسلام ہی ایک ایسی قوت ہے جس نے برصغیر کے پراگندہ مسلمانوں کو ناقابل شکست طاقت بنایا تھا اور آج بھی یہی طاقت مشرق ومغرب کو ایک لڑی میں پرو کر اسکے نام لیواؤں کو "جسد واحد" بنا سکتی ہے۔ حیرت ہے کہ بعض لوگ مغربی تہذیب کے شجرۂ خبیثہ کے سایہ میں بیٹھ کر اپنی بقاء ترقی اور استحکام کیلئے کیسے کیسے طریقے سوچ رہے ہیں۔ عورتوں اور مردوں کے باہمی اختلاط اور رقص وسرود کی تقریبات کے ذریعہ ہرگز جغرافیائی اور قومی امتیازات مٹائے نہیں جاسکتے۔ تاریخ کے ہر دور میں یہ حد بندیاں صرف اسلام ہی سے مٹ سکی ہیں۔

دوسری چیز جو یہاں کے دینی تصلب کی آئینہ دار ہے وہ یہ تھی کہ ڈھاکہ، چٹاگانگ جیسے اہم شہروں کی شاہراہوں اور گلیوں میں ہمیں عریانی اور بے پردگی اور لباس وعادات واطوار میں یورپی

فیشن کی وہ وبا نظر نہ آئی جو بدقسمتی سے ہمارے ہاں کے تمام اہم شہروں کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے دینی اثرات کو محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ مادی اور صنعتی ترقیات حاصل کرتے ہوئے اس نام نہاد تہذیب اور نئی روشنی سے یہ علاقہ محفوظ رہے جس نے مسلمانوں کو اپنے اقدار سے بیگانہ کرکے ہزاروں معاشی اور سماجی مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔ مگر افسوس کہ یہ امید پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ مغربی پاکستان کیطرح وہاں بھی آئے دن ثقافت، کلچر اور ثقافتی طائفوں وغیرہ کے مظاہروں کے ذریعہ دینی گرفت کو کمزور کیا جا رہا ہے، اس کی ایک مثال چٹاگانگ میں ہمارے سامنے آئی کہ قرآن کریم کے نام سے منعقد ہونے والے اجتماع کو مسلم ہال کے اندر انعقاد کی اجازت نہ مل سکی اور منتظمین کو باہر لان میں انتظام کرنا پڑا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ چونکہ کل پرسوں اسی ہال میں چینی طائفہ کے رقص و سرود کا پروگرام ہے اس لئے اس کے اہتمام میں راتوں رات ہال کی آرائش ضروری ہے، جبکہ شہر کے شرفاء نے ان خرافات سے اپنی بیزاری بھی ظاہر کر دی تھی۔

ایک اور چیز جو پوری سنجیدگی سے غور و فکر کی مستحق ہے، وہ اس علاقہ میں کیمونزم کے بڑھتے ہوئے اثرات ہیں، کیمونزم کے حق میں بعض عناصر علانیہ جگہ جگہ مظاہرے کرنے سے بھی نہیں جھجکتے۔ اس قسم کا ایک جلوس دیکھنے کا اتفاق چٹاگانگ میں ہوا جو کیمونزم کے حق میں مظاہرہ کر رہا تھا۔ کیمونزم کا لٹریچر تیزی سے پھیل رہا ہے۔ جو شہروں اور اسٹیشنوں کے بک سٹالوں پر بافراط نظر آتا ہے ــــ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اپنا آئیڈیل ماؤزے تنگ اور کارل مارکس کو بناتا جا رہا ہے جس کی بنیادی وجہ دینی تعلیم سے غفلت اور پھر اب تک اسلام کے عادلانہ معاشی نظام سے گریز کرنا ہے۔ مختلف طبقات کی معاشی مشکلات اور ناقابلِ برداشت طبقاتی تفاوت کا علاج اسلام ہی میں ہے، مگر جب اذہان اس اٹل سچائی کے بارہ میں اب تک تذبذب اور تشکیک کا شکار ہوں تو اس نسخہ شفا کو آزمائیں تو کیسے؟

ملک کی صحافت پر جو بنگلہ اور انگریزی اخبارات چھائے ہوتے ہیں۔ ان کی اکثریت اسلام اور اس کے اساسی نظریات کو اہمیت نہیں دیتی ایک اہم انگریزی اخبار کے ایڈیٹر کے متعلق سُنا کہ وہ اسلام کو صرف دو قومی نظریہ کی کامیابی اور ملک کی تقسیم تک ضروری سمجھتا رہا۔ اب جب ہم ایک قوم ہیں تو اسلام اور دین کی کیا ضرورت ہے؟ ــــ ایک دوسرے اخبار کے مدیر اسلامی مضامین کی اشاعت سے اس لئے کنارہ کشی کرتے رہے کہ اسطرح نہ اشتہار ملیں گے، اور نہ اونچے طبقہ میں پرچہ مقبول رہ سکے گا، کیمونزم کے توڑ کیلئے ضرورت ہے کہ وہاں کی علاقائی زبانوں میں اور صحافت کے میدان میں اسلامی جذبات کو برقرار رکھنے کی بھرپور سعی کی جائے اس سلسلہ میں

علماء پر بھی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر ہمیں ملک، قوم اور اپنی اقدار و روایات کی حفاظت محبوب ہے تو ہمیں اوروں کے غیر منصفانہ معاشی نظاموں سے ہٹ کر اسلام کے حصار میں ملک کے تمام طبقوں کو فارغ البالی، اور آرام و راحت کی زندگی مہیا کرنی ہوگی۔ کمیونزم، جبر و استبداد، لوٹ کھسوٹ اور فاقہ کشی سے پھیلتا ہے، جس کا علاج کمیونزم میں نہیں جو بجائے خود ایک مہلک مرض اور ناسور ہے، بلکہ اس کا مداوئی صرف محمد عربی فداہ ابی و اُمّی کے دامنِ عاطفت میں مل سکتا ہے ــــ جس ملک کو خدا نے بے حساب قدرتی وسائل اور مادی نعمتوں سے نوازا ہے ناممکن ہے کہ صحیح منصوبہ بندی کے ہوتے ہوئے کسی باشندے کو فارغ البالی نصیب نہ ہو سکے۔ کمیونزم کے علاوہ دیگر علمی اور فکری فتنے بھی وہاں اُبھر رہے ہیں۔ قادیانیت پوری تیزی سے اپنی جڑیں پھیلا رہی ہے۔ وہاں کے بعض حضرات کے کہنے کے مطابق دیناج پور سے ۷۰ میل دور بھارتی سرحد کے قریب ان لوگوں نے کسی طریقے سے ۵ گاؤں حاصل کر کے وہاں احمد نگر کے نام سے ایک مرکز بسانا شروع کر دیا ہے۔ پتہ نہیں ہماری نگاہ کیوں اس طرف نہیں جاتی کہ یہ چیز سیاسی نقطۂ نظر سے کتنی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے ــــ! کیا ملک کے دونوں حصوں میں ان لوگوں کا سرحدی علاقوں ہی کو خاص نشانہ بنانا کسی خاص سکیم کی غمازی تو نہیں کر رہا؟ عیسائیت مشنریوں کے نام پر اپنے کام میں مصروف ہے۔ بھارت بھی یقیناً در پردہ شرارتوں سے اُدھار نہیں کھاتا ــــ اس ملک کے باشندوں کے دینی احساسات، حب الوطنی اور پھر جغرافیائی نزاکت کے ہوتے ہوئے ان بے احتیاطیوں پر باشعور لوگ خون کے آنسو روتے ہیں۔ یہاں تو ہر اس چیز پر کڑی نگاہ رکھنی تھی جس سے اس ملک کی رائے عامہ پر اسلام کا تسلط کمزور اور مجروح اور لادینی عناصر کو اُبھرنے کا موقع مل سکتا ہو ــــ مگر ــــ ہائے افسوس! کہ جب احساسِ زیاں ہی نہ رہے تو پھر متاعِ کارواں کا خدا ہی محافظ ہے۔

ہماری دلی آرزو ہے کہ ملک کے یہ دونوں حصے اسلام کی نعمت سے مالا مال ہو کر پھلیں پھولیں اور پوری اتحاد و یگانگت سے اس ملک کی دینی اور مادی تعمیر و استحکام میں دونوں رواں دواں رہیں کہ ہر ایک کی ترقی اور تر و تازگی پر دوسرے کی زندگی کا انحصار ہے ــــ

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

ضبط و ترتیب : ادارۃ الحق

تبدّل اور تحریف سے محفوظ کتاب

قرآن کریم

حضرت شیخ الحدیث نے یہ تقریر تعلیم القرآن سوسائٹی ڈھاکہ کے زیر اہتمام جلسہ عام میں ڈھاکہ کے اہم تجارتی مرکز بیت المکرم کی عظیم الشان جامع مسجد میں ہزاروں افراد کے مجمع میں ۲۴ فروری ۱۹۶۸ء کو نماز عصر کے بعد ارشاد فرمائی ـــــ (ادارہ)

(خطبہ مسنونہ کے بعد)

محترم بزرگو اور بھائیو! آپ حضرات سے ملاقات کی عرصہ سے خواہش تھی۔ دیوبند کے زمانہ قیام میں مشرقی پاکستان کے بہت سے احباب ساتھی رہے، پھر اسباق میں بھی کافی احباب کی شرکت رہی اُس وقت سے یہ علاقہ دیکھنے کا جذبہ دل میں موجزن رہا۔ پھر جب پاکستان بنا تو فطری طور پر اس خواہش میں اضافہ ہوا کیونکہ یہ حصہ ہمارے ملک کا اہم ترین بازو ہے۔ یہاں کے دینی جذبات کا حال سنتا بھی رہا اور کل سے دیکھ کر مجھے مسرت ہو رہی ہے کہ پاکستان کا جو دیندار اور مضبوط بازو ہے اور جس سے دین کی حفاظت کی توقع کی جا سکتی ہے وہ بفضل خدا یہی حصہ ہے۔ میں تعلیم القرآن سوسائٹی اور اس کے اراکین بالخصوص اپنے مخلص دوست حاجی بشیر الدین بوگرہ صاحب کا ممنون ہوں جن کی تحریک اور خواہش پر یہاں آنے کا اتفاق ہوا۔

دنیا کے مسلمان اس سال قرآن کریم کا جشن منا رہے ہیں اور مختلف ادارے نزول قرآن کے بارہ میں تقریبات منعقد کر رہے ہیں۔ اگرچہ قرآن سے عقیدت کا اظہار اور اس نعمت کا شکریہ ساری دنیا کے مسلمان تمام عمر بھی ادا نہیں کر سکتے۔ اس نعمت کی شکر گذاری میں اگر ساری زندگی اور جان و مال

لٹ جائے تو اس کا حق ادا نہیں ہو سکے گا، کہاں انسان ناتوان اور بے کس مخلوق اور کہاں خداوندِ کریم کی لامحدود اور بے حد وحساب نعمتیں (وان تعدّوا نعمۃ اللّٰہ لا تحصوھا۔ اگر تم سب مل کر بھی خدا کی نعمتیں گننا چاہو تو نہ گن سکو گے ۔۔۔ پھر جب خدا نے خود فرمایا ان الانسان لظلومٌ کفار۔ بیشک انسان اپنے اوپر ظلم کرنے والا بڑا ناشکرا ہے ۔۔۔ تو انسان کہاں نعمت قرآن کا حق ادا کر سکے۔۔۔؟ پھر بھی کیا عجب کہ یہ ظاہری اور رسمی تعلق اور لگاؤ خداوندکریم کی بارگاہ سے شرف قبول پاکر حقیقی معنوں میں قرآنِ حکیم پر عمل کرنے کا ذریعہ بن جائے ۔۔۔ خریدارانِ یوسفؑ میں ایک بڑھیا نے بھی اپنا نام شامل کیا تھا۔ ہماری حیثیت تو اس بڑھیا سے بھی کم ہے۔ لیکن اگر خداوندکریم ہمیں بھی خریداران قرآن کی فہرست میں شامل فرمائے تو یہ ہماری نجات کا ذریعہ ہو گا۔۔۔

بھائیو! قرآنِ مجید دنیا کی ہدایت کیلئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک کتاب ہے، جس کے بھیجنے والے (مُوحِی) خود اللہ تعالیٰ ہیں۔ اور جو اس وحی کا لانے والا ہے وہ حضرت جبرئیلؑ جیسی قوی اور امین ذات ہے اور جس پر وحی نازل ہوئی یعنی جو موحیٰ الیہ ہیں وہ سید العالم سید الکائنات رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اوّلین و آخرین کا علم عطا فرمایا اور تمام علوم اور نوامیس کی تکمیل آپ کی ذات پر ہوئی۔ حجۃ الوداع کے موقع پر حضورِ اقدسؐ میدانِ عرفات میں قدسیوں کی جماعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہیں کہ خداوندکریم کیطرف سے اس نعمتِ عظمیٰ کی تکمیل کا اعلان ہوا۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا	آج کے دن میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور میں نے تمہارے لئے اسلام پسند کر لیا۔

خداوندکریم نے اپنی ہدایات اور نزولِ علوم کا جو سلسلہ حضرت آدمؑ سے شروع فرمایا تھا آپؐ کی ذات پر اسے تکمیل تک پہنچایا۔ یہ خداوندکریم کی شانِ ربوبیت ہے کہ ہر چیز کو ترقی و کمال تک آہستہ آہستہ پہنچاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت تکوینیات اور تشریعیات دونوں میں جاری ہے۔ بچے کو خداوندکریم ایک سیکنڈ میں کمال تک پہنچا سکتا ہے۔ اذا اراد شیئا ان یکون فیقول لہٗ کن فیکون جب وہ کسی چیز کے ہو جانے کا ارادہ فرماتے تو کہہ دیتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے۔

پھر یہ سیکنڈ بھی ہماری زبان پر ہے ورنہ حکم خدا "کُن" کے سامنے اتنا وقفہ بھی نہیں۔ اگر چاہے تو ساری زمین آن بسیط میں سبزیوں، ترکاریوں اور باغات سے بھر دے۔ مگر فصلیں مہینوں

میں اور باغات سالوں میں کمال تک پہنچتے ہیں۔

پھر اس حقیقت میں ذرہ بھر اخفاء نہیں کہ ہم اپنی مرضی سے اس دنیا میں نہیں آئے نہ خود بخود پیدا ہوئے۔ افسوس کہ جہالت کا زمانہ ہے، چاہیے مشاہدات اور مادیات کے تجربات کے لحاظ سے نہ ہو مگر روحانیات اور حقائق کے ادراک کے لحاظ سے جہل کا دور ہے، آج خدا سے انکار وحی سے انکار ہے، اور کھلم کھلا تحریکیں اینٹی گاڈ اور مذہب سے انکار کی چل رہی ہیں۔ اور یہ ایک ایسی جہالت ہے کہ ایک سلیم الفطرۃ اور ان پڑھ انسان بھی اسے حماقت ہی سمجھے گا۔ مگر روشن خیالی اور عقلمندی کا دعویٰ کرنے والے اسے عقل و خرد کا ثبوت سمجھتے ہیں۔ وہ زمانہ بھی گذرا ہے کہ ایک بدھو گنوار سے کسی نے دریافت کیا کہ تمہارے پاس خداوند کریم کے وجود کی کیا دلیل ہے اس نے لاٹھی اٹھا کر اسے مارتے ہوئے کہا:

البعرۃ تدل علی البعیر وآثار الاقدام	مینگنی اونٹ پر دلالت کرتی ہے اور قدموں کے
علی المسیر فسماءٌ ذاتُ ابراجٍ وارضٌ	نشان کسی کے چلنے پر، پس بڑے بڑے برجوں
ذات فجاج کیف لا تدلان	والا آسمان اور بڑی بڑی گھاٹیوں والی زمین ایک
علی اللطیف الخبیر۔	لطیف و خبیر ذات پر دلالت نہ کرے۔

کیا یہ عظیم ستارے یہ زمین یہ نہریں یہ دریا اور یہ ساری کائنات خود بخود پیدا ہوئی۔؟ اگر یہ فلسفی اور دہری خود بخود دنیا میں آئے ہیں تو مرتے کیوں ہیں؟ کیوں انہیں اپنے آپ کو بچانے پر اختیار نہیں۔؟ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے زمانہ میں کسی دہری نے خدا کے وجود پر مسلمانوں کو چیلنج دیا۔ حضرت امام کے ساتھ مناظرہ طے ہوا۔ وقت اور مقام مقرر کیا گیا، حضرت امام صاحب وقت مقررہ سے کچھ دیر بعد میں پہنچے۔ منکر خدا نے شور مچایا کہ جو شخص وعدے اور بات کا پکا نہ ہو اس کا علم اور کردار کیا پختہ ہو گا۔ امامؒ نے وہاں پہنچ کر فرمایا کہ میرے راستہ میں ایک دریا حائل تھا، جہاں نہ کشتی تھی، نہ ملاح، یکایک دریا میں کچھ تختے ظاہر ہوئے کہیں سے میخ کہیں سے لوہا، پھر خود بخود یہ تختے آپس میں جڑنے لگے اور کشتی تیار ہو گئی۔ جب میں اس میں بیٹھ گیا تو وہ بغیر ملاح کے خود بخود اس کنارے سے روانہ ہو کر اس کنارے آ گئی، تب میں یہاں پہنچا اس وجہ سے کچھ تاخیر ہوئی۔ یہ سن کر دہری مناظر بھڑک اٹھا اور چیخنے لگا کہ اس شخص سے کیسے مناظرہ کروں جو اتنی خلاف عقل اور غلط بات کہتا ہو ۔۔۔ یہ فلسفی اور دہری لوگ ہمیشہ سے عجیب بد دماغ واقع ہوئے ہیں۔ کوئی معجزہ کوئی کرامت کوئی خرق عادت بیان کرو تو شور مچائیں گے کہ طبعی حالت سے خلاف ہے عقل اسے تسلیم نہیں کرتی

اور خود ساری کائنات کو بغیر صانع و خالق کہہ کر بھی اپنے آپ کو عقلمند سمجھتے ہیں۔ تو امام صاحب نے جواب دیا کہ بس ہمارا مناظرہ اس بات پر ختم ہوا اور یہ ثابت ہو گیا کہ جب ایک کشتی بغیر مستری اور ملاح کے نہ تیار ہو سکتی ہے نہ چل سکتی ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس ساری کائنات اور پر حکمت عالم کی کشتی بنانے والا اور اس کا نظام چلانے والا کوئی نہ ہو۔؟ اور پھر کیسا عجیب اور پیچیدہ نظام ہے۔؟ صرف انسانی جسم کی باریکی اور حکمتوں کو دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ منہ میں جب نوالہ ڈالا جائے تو منہ کے اگلے حصہ میں جو دانت ہیں اسے چھری کیطرح تیز بنایا تاکہ سخت چیزوں کو توڑا جا سکے۔ پھر پچھلے دانتوں کو چکی کے دو پاٹوں کی طرح کہ وہ اسے باریک کر دیں۔ پھر تالو اور زبان کی خلقت ایسی کی گئی کہ وہ کھانے والے چیز کو سمیٹ لیتا ہے اور گلے کیطرف بھیج دیتا ہے۔ اسی طرح ہر قسم کی چیز اٹھانے کے لئے ہاتھ میں انگلیاں رکھیں اور اشیاء کی اذیت اور ضرر سے بچنے کے لئے انگلیوں کے سروں میں حرارت اور برودت کا احساس سب سے زیادہ رکھا۔ پھر قبض و بسط کی ضرورت ہے کہ ہر چیز کی موٹائی اور حجم الگ الگ ہوتا ہے۔ اس کے لئے ہر انگلی میں تین تین جوڑ پیدا کر دئے کہ جتنا چاہو انہیں کھول دو۔ پھر ایک ہاتھ تنظیف اشیاء کیلئے رکھا اور ایک غیر تنظیف کیلئے کہ جس سے ناک سینکا جائے اور استنجاء کیا جائے ـــــ اسی طرح پوری کائنات کو لیجئے موجودہ سائنس دانوں کو اعتراف ہے کہ اگر یہ چاند اور یہ سورج اپنے مدار اور موجودہ محل وقوع سے ذرا پیچھے ہٹ جائیں یا نیچے ہو جائیں تو گرمی اور سردی دونوں میں اتنی بے اعتدالی آجائے کہ ساری دنیا گرمی یا سردی کی شدت سے ختم ہو جائے اور موجودہ سارے احوال اور کیفیات بدل جائیں گے۔ غرض ایک ایک ذرہ ایک ایک چیز میں غور وفکر سے پتہ چلتا ہے کہ اسے ایک علیم و حکیم رب نے پیدا کیا اور اس احکم الحاکمین نے اس میں ہر ہر ضرورت کا لحاظ کیا۔ اور یہ سارا نظام اس طریقے سے بنایا کہ انسان ہر چیز سے فائدہ اٹھا سکے اور وہ اس کے لئے کارآمد ہو ہر چیز حکمت خداوندی کی آئینہ دار ہے اور ہر چیز مناسب ہے۔ وکل شیئ عندہ بمقدار۔ انسان کھانے پینے رہنے سہنے کا محتاج ہے۔ تو وہ سب چیزیں عطا فرما دیں جس سے یہ خود زندہ رہ سکے پھر اسے اپنی نسل باقی رکھنے کیلئے توالد و تناسل کا طریقہ بتلایا اور بقائے نسل کی جو ضروریات تھے وہ چیزیں بھی عطا فرما دیں ـــــ ـــــ دیکھئے راستہ پر چلنے کیلئے پاؤں کی ضرورت ہے اور راستہ کی رکاوٹوں اور ضرر رساں چیزوں سے بچنے کے لئے آنکھوں کی ضرورت ہے تو آنکھیں بھی عنایت فرما دیں زندہ رہنے کے لئے ہوا کی ضرورت ہے۔ تو ہر جگہ ہوا کا خزانہ بھی عام کر دیا۔ پھر ہمیں ایک دوسرے تک اپنی باتیں پہنچانی تھیں

تو یہی ہوا آواز پہنچانے کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔ یعنی ہوا آواز و اصوات سے متکیف ہو کر دوسرے تک آواز پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ اور اس ہوا کو روک کر دماغ تک پہنچانے کیلئے ایک گول دائرہ کی شکل میں کان دیئے جو ہوا کو روک کر آواز اندر پہنچا دیتے ہیں۔ اگر کان نہ ہوتے اور صرف سوراخ ہوتا تو آواز سے متکیف ہوا بمشکل اندر جاتی اور اگر کان آواز کی شدت کو اعتدال پر نہ رکھتے تو بسا اوقات آواز کی تیزی کی وجہ سے دماغ کا پردہ پھٹ جاتا۔ ان حکمتوں کی وجہ سے ایک خاص نہج پر کان بنا دیئے۔ بیشک وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا...... وما بکم من نعمۃ فمن اللہ۔ اور تمہارے اوپر جو بھی نعمت ہے وہ خدا ہی کی جانب سے ہے۔

بھائیو! ذرا خدا کی نعمتوں پر سوچتے رہو۔ یہ آیات آفاقی اور انفسی خدا کی پہچان کا ذریعہ ہیں۔ مگر غور و فکر اور سوچنے کا وہ مطلب نہیں جس کی آجکل دعوت دی جارہی ہے اور کہا جارہا ہے کہ قرآن پر سوچو، اور پھر اپنے اس من گھڑت تفکر اور اختراعات کو قرآن کا خلاصہ اور نچوڑ کہا جا رہا ہے۔ سوچنے سے کون منکر ہوگا۔ مگر قرآن میں تفکر سے مراد وہ غور و فکر ہے، جو خود حضورؐ نے فرمایا۔ حضرت صدیقؓ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ نے قرآن پر سوچا ہے۔ لاکھوں صحابہؓ کروڑوں تبع تابعین نے تفکر کیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام بخاریؒ اور امام احمدؒ نے غور و فکر کیا ہے۔ اور قرآن کے معانی سمجھ لینے سے ان کی عاقبت سنور گئی، اعمال اچھے ہوگئے اور دین و دنیا کی فلاح و بہبودی ان کے ہاتھ آئی۔ اور اس غور و فکر کو انہوں نے معرفت رب اور ایمان بالغیب کا ذریعہ بنا دیا۔ مگر آج ہمیں دعوت دی جارہی ہے کہ "ان سب طور طریقوں اور پرانی لائن سے ہٹ کر تفکر کرو اور اس انداز سے تفکر کرو کہ پرانی سب چیزیں چھوٹ جائیں اور تم ہیں اور یہود و نصاریٰ میں کوئی امتیاز اور فرق باقی نہ رہ سکے، چاہے قرآن کے الفاظ کو باقی رکھو مگر اپنے غور و فکر کے ذریعہ ان کے معانی اور مصداقات تبدیل کر دو۔

حضور اقدسؐ کو کفار نے بڑی سے بڑی پیشکش کی کہ اللہ تعالیٰ کیطرف سے لوگوں کو دعوت تو دیجئے مگر ہمارے معبودوں کی مخالفت مت کیجئے۔ آج بھی کہا جارہا ہے کہ لا الہ الا اللہ تو سنوایئے مگر پیغمبر ماننے کی شرط اسلام کے لئے لازم نہ کیجئے۔ یعنی پیغمبر کو ماننا یا اس کو خاتم النبیین کہنا ضروری نہیں (معاذ اللہ)

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس قسم کی تقسیم اور تفریق کرنے اور اس میں تبدیل و تحریف کرنے والوں

کے بارہ میں فرمایا :

ان الذین یکفرون باللہ ورسلہ ویریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسلہ ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض ... اولئک ھم الکٰفرون حقا۔	بیشک جو لوگ خدا اور رسول کے درمیان تفریق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بعض کو مانیں گے اور بعض کو نہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنے لئے بیچ کی راہ نکال لیں۔ بیشک یہی لوگ کافر ہیں ٹھیک ٹھیک۔

یہ کہنا کہ قرآن کو تو مانتے ہیں مگر پیغمبر کی تشریحات و اقوال کو نہیں مانتے یہ تو ایسا ہے کہ ایک شخص کہتا ہے کہ میں اس ملک کے صدر کو تو مانتا ہوں مگر اس کے نمائندہ کو نہیں مانتا تو کہا جائے گا کہ یہ سچا باغی ہے ...... تو خداوند کریم نے ایسے لوگوں کے بارہ میں فرمایا کہ بیشک یہی لوگ سچے کافر ہیں حضورؐ کو بھی کہا گیا تھا کہ درمیانی راستہ اختیار کرو۔ تشدد نہ کرو بلکہ بعض باتوں کے نہ ماننے اور اس میں کمی بیشی کی گنجائش نکال دو ۔۔۔ اور آج بھی ایسی آوازیں اٹھتی ہیں۔ تو قرآن کریم نے ان باتوں کا جواب دیا :

قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی ان اتبع الا ما یوحیٰ الیّ۔	تم کہہ دو کہ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اپنی طرف سے اس کو تبدیل کر دوں میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ کو وحی کی جائے۔

میری یہ شان نہیں کہ اپنی طرف سے اس دین میں گڑبڑ کروں اور اسے اپنی مرضی کے موافق معانی پہنا دوں میں اپنی جانب سے ذرہ برابر تبدیل و ترمیم نہیں کر سکتا۔۔

ہمیں آج سوچنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ بیشک قرآن میں جگہ جگہ سوچنے کی دعوت ہے مگر اس تفکر کا مطلب تو یہ تھا کہ مثلاً حضرت موسیٰ کی قوم کے حالات پر نظر کرو انبیاء کی اولاد تھی اور جب متبع شریعت تھی تو خدا نے ان کو مصر کی حکومت دی، فرعون اور اس کی قوم کو غرق کر دیا اور عمالقہ کی املاک پر ان کی سلطنت قائم فرما دی ان میں سے سلیمان علیہ السلام جیسے بادشاہ اور لقمان حکیم جیسے عقلمند پیدا فرما دئے اور وفضلناھم علی العالمین کی بناء پر انہیں اپنے زمانہ کی تمام اقوام پر فضیلت دی۔ مگر مادی شان و شوکت اور ہر طرح سامانِ معیشت کی فراوانی کی وجہ سے انہوں نے کونسا راستہ اختیار کیا۔؟ ان کا شیوہ تھا کہ ویقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل جن چیزوں کے ملانے کا خدا نے حکم دیا تھا اسے توڑتے تھے، نیز ان کی حالت یہ تھی کہ یحرفون الکلم من بعد مواضعہ اللہ کی باتوں کو ان کی جگہوں سے بدل دیتے تھے۔

ان کو کہا گیا کہ والدین سے رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرو، انسانیت کی بھلائی چاہو، انبیاء کا احترام کرو، اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی مت کرو تو انہوں نے ان سب چیزوں کو توڑ دیا دیفسدون فی الارض۔ زمین میں فساد برپا کیا، کہیں زنا کا بازار گرم کیا تو کہیں رقص وسرود کا سلسلہ شروع کیا، پھر اس کے ساتھ یہ عیاری اور چالاکی کی اپنی مرضی کے علماء کو جمع کر کے انہیں آسمانی تعلیمات میں ترمیم وتبدیل اور احکام الٰہی سے فرار کے راستے نکالنے پر مامور کیا جس کے نتیجہ میں خداوند کریم نے انہیں لعنت کا مستحق قرار دیا اور اپنی رحمت سے ہٹا دیا۔ یہ لوگ مشرک نہیں تھے۔ کلمۂ توحید کہتے تھے۔ رسالت موسیٰ علیہ السلام کا اقرار کرتے تھے مگر جرم یہ تھا کہ یحرفون الکلم عن مواضعہ۔ احکام الٰہی کو اپنی جگہ سے ہٹاتے تھے اور اپنی مرضی اور خواہشات کے مطابق اسکی توجیہ وتاویل کرتے، مثال کے طور پر جی میں آیا تو سود کو حلال کہا کہ مطلق سود تو خدا کا مراد نہیں اضعافاً مضاعفۃ (سود مرکب) حرام ہے۔

یہ ہے تاویل وتحریف جو یہود کا شیوہ ہے۔ خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے یہود پہ اپنا غضب ڈال دیا اور انہیں ذلت اور خواری میں مبتلا کر دیا۔ آج اگر ہماری تنبیہ اور نصیحت کے لئے یہود کو کچھ غلبہ ہوا ہے تو اس سے پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ یہود کو خدا نے جن گمراہیوں اور طور طریقوں کی وجہ سے ذلت میں ڈال دیا اگر وہی چیزیں ہمارا شیوہ بن جائیں تو وہ ہمیں ایک مغضوب قوم کے ہاتھوں تنبیہ کرانے پر بھی قادر ہیں۔ اور ہمیں متنبہ کر دیا۔ آج اگر کچھ عارضی شان وشوکت ہے تو وجہ یہ ہے کہ اللہ تو سب کا رب ہے، کافر کو بھی روٹی دیتا ہے۔ وہ سب کو حصلہ نہیں کہ ذرا سی بات پر کسی کو گھر سے نکال دے۔ وہ تمام عالمین کا رب اور سب کا پالنے والا ہے۔ اور پھر حکیم اور علیم بھی ہے۔ یہود کے عارضی غلبہ کے بعد دنیا کی بڑی طاقت امریکہ کی تھی اس نے یہود کو آگے کر دیا تو خدا نے اسی امریکہ کو ویٹ نام میں ایسا مٹایا کہ اس کی ساری فرعونیت خاک میں مل گئی کہ جب امریکہ نے مغضوب اور ملعون قوم کا ساتھ دیا تو خود بھی ملعون اور مغضوب بن گیا۔ امریکہ کی رسوائی بھی یہود کے ذلیل ہونے کی دلیل ہے۔ جب کوئی طاقت اور حکومت ظلم اختیار کرے تو ظالم کا تختہ جلد الٹ جاتا ہے۔

سورۃ بقرہ میں یہود کے ان واقعات میں مسلمانوں کے لئے نصیحت ہے کہ خدا نے تمہیں سب سے بہتر امت اور حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا غلام بنایا اور حضورؐ کی غلامی اتنی بڑی چیز ہے کہ قیامت کے دن حضورؐ سب سے پہلے قبر سے اٹھیں گے۔ پھر اہل مدینہ، پھر اہل مکہ،

پھر تمام مسلمان، اسی طرح تمام مسلمان سب سے پہلے پل صراط سے حضورؐ کے ساتھ گذریں گے۔ سب سے پہلے آپؐ اور آپ کی امت کیلئے جنت کا دروازہ کھول دیا جائے گا ۔۔۔ دیکھئے صدر کہیں جارہا ہو تو اس کا جوتے اٹھانے والا، پنکھا چلانے والا خادم اور غلام بھی ساتھ ساتھ جاتا ہے۔ اگر کوئی صدر کا چپڑاسی ہے تو وزیر اعظم سے بھی پہلے صدر کے ساتھ ساتھ جائے گا۔ حضورؐ تمام انبیاء کے سردار ہیں۔ تو غلامانِ محمدؐ بھی ساتھ ہی ہوں گے ۔۔۔۔ تو اس امت کو جو حضورؐ کے صدقے سے خیر الامم ہے، بقرہ میں بنی اسرائیل کے واقعات سے سبق لینے کی تلقین کی گئی کہ اس شان کے باوجود اگر تم نے نافرمانی کی اور اپنے آپ کو دوسری قوموں کی حالت اور حیثیت پر بدل دیا۔ اور دوسروں کی تقلید سے مرعوب ہو کر اپنے دین سے ہاتھ دھو بیٹھے، کہیں سنت سے انکار، کہیں قرآن سے انکار، کہیں دیگر محرمات و محلات میں تبدیلی کی تو تمہارا انجام بھی یہود جیسا ہوگا۔

قرآن پاک ہمیں اس قسم کے غور و فکر کا سبق نہیں دیتا کہ ہم اوروں سے مرعوب ہو کر ان کی آنکھوں سے قرآن کو دیکھیں ۔۔۔ آج اسی کروڑ مسلمان تھوک کر بھی یہود کو ڈبو سکتے ہیں ... مگر آج بجائے فاتح کے مفتوح ہیں۔ اس لئے کہ بجائے اتباع قرآن کے ہم ماحول سے ڈر رہے ہیں۔ کہ جاپان، چین، امریکہ اور روس کا ماحول بدل چکا ہے، تو مولوی صاحب تم بھی ذرا سوچو ماحول کو بدل دو تنگ دائرہ میں کیوں بیٹھے ہو ذرا ماحول کی رعایت کر کے دین میں کچھ نرمی پیدا کر دو۔"

حضورؐ کی بعثت کے وقت دنیا زنا، سود اور شراب سے بھری ہوئی تھی تمام ممالک پر ان کفریات کا غلبہ تھا تو کہنا چاہیئے تھا کہ کچھ نرمی ہونی چاہیئے اور زنا اور سود خواری حرام نہ ہونی چاہیئے: ترقی کی جو صورت قیصر اور کسریٰ کو نصیب تھی حضورؐ نے اس نام نہاد ترقی کی خاطر اپنی امت کو اُن کے راستہ پر کیوں نہ ڈالا۔؟ وہاں تو ایک ایک صحابیؓ کا یہ حال ہے کہ دین کے کسی مسئلہ اور حضورؐ کی کسی سنت کی خاطر ماحول کی ذرہ برابر پرواہ نہ کی۔ حضرت حذیفہؓ بن الیمان بہت بڑے علاقہ کے حاکم تھے ایک دن بڑے بڑے امراء اور رؤساء دیگر قوموں کے موجود تھے۔ بہت بڑے مجمع میں ان کے ہاتھ سے ایک نوالہ گرا ساتھیوں نے اشارہ سے کہا اسے مت اٹھائیے اس کا اٹھانا بری بات ہے، فیشن اور ترقی کے خلاف ہے حضرت حذیفہؓ ان باتوں کو کب خاطر میں لاسکتے تھے ۔۔۔ ایک نوالہ بھی خدا کی دی ہوئی نعمت ہے اگر اس کے ساتھ کچھ آلائش ہے اُسے ہٹا کر کھا لیا جائے تاکہ خدا کی نعمت کی بے قدری نہ ہو اور جب تم بے قدری نہ کرو تو خدا نعمتوں میں اضافہ کر دے گا۔ ولئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید۔ تو حضرت حذیفہؓ نے

اپنے ساتھیوں کو ڈانٹ کر کہا کہ ان کتوں کی وجہ سے میں اپنے نبی کی سنت چھوڑ دوں اور ماحول سے دب جاؤں۔

حضرت عمرؓ بیت المقدس میں فاتحانہ داخل ہو رہے ہیں، پھٹے پرانے پیوند لگے کپڑے پہنے ہیں۔ سواری کیلئے اونٹنی ساتھ ہے بعض لوگوں نے اچھے کپڑے اور گھوڑا پیش کر دیا کہ کافر اور مسیحی سب استقبال کے لئے کھڑے ہیں۔ مگر حضرتؓ نے انکار کر دیا کہ میں ان سے متاثر ہو کر کیوں اپنی عادت اور تہذیب بدلوں اسی اونٹنی کی سواری میں ان کا غلام بھی شریک تھا۔ اور شہر میں داخلہ کے وقت اتفاقاً غلام کی باری تھی، آپ نے غلام کو اونٹنی پر بٹھلایا اور خود مہار پکڑے جا رہے تھے۔

یہ تھا ان حضرات کا کردار، دین پر عمل کرنے کیلئے سوچ و فکر کا انداز کہ قرآن کے سیاق اور سباق کے مطابق اور حضورؐ کی ہدایات و ارشادات کی روشنی میں احکام کا استنباط اور استخراج کیا جائے نہ کہ دیگر اقوام کی تقلید میں اور ماحول کی موافقت میں وحی الٰہی کو تبدیل کیا جائے۔ پیغمبرؐ کو خدا کا حکم تھا: مایکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی - میری کیا مجال کہ اپنی مرضی سے اس میں تبدیل کروں۔ جس خدا نے ہمارے لئے دیگر ضروریات پیدا کیں جس نے مادی حاجات سے ہمیں مستغنی کر دیا، اُس نے اپنی مرضیات پر چلنے اور اپنے ساتھ تعلق قائم کرنے کے لئے وحی بھی نازل کی زبان، عقل، فکر، روح سب خدا نے دیں تو ہدایت اور رہنمائی بھی ہماری اللہ ہی کر سکتا ہے۔ اُس نے دیگر ضروریات کیطرح ابتدائے آفرینش سے روحانی تربیت کی ضرورت بھی پوری فرما دی، آدم علیہ السلام سے حضور اقدسؐ تک انبیاء کا سلسلہ چلایا۔ کسی کے اوپر کتابی کسی کے اوپر صحیفی اور کسی کے اوپر کلامی شکل میں اپنی ہدایت نازل فرمائی اور حضور اقدسؐ کو علمی لحاظ سے سب سے جامع اور مکمل کتاب دی گئی کہ آپ کا خاص شان علم ہی تھا۔ معراج کی رات جبرئیل علیہ السلام نے چار گلاس پیش فرمائے، جن میں دودھ، شہد، پانی اور شراب تھا۔ گو وہ شراب جنت کا تھا جس میں نشہ وغیرہ نہ ہوگی۔

لا فیھا غولٌ ولا ھم عنہا	نہ اس شراب سے سر پھرتا ہے۔ اور نہ وہ اسکو
ینزفون۔	پی کر بہکیں۔

پھر بھی حضورؐ نے دودھ کے گلاس کو پسند فرمایا۔ حضرت جبرئیلؑ نے اس پر خدا کا شکر ادا کیا اور فرمایا کہ الحمد للہ خدا نے آپ کی رہنمائی فرمائی۔ عالم مثال میں دودھ علم کی مثال ہے۔ اور حضورؐ نے علم کو پسند فرمایا۔ آج جو ترقیات علمی اور سائنسی آپ دیکھ رہے ہیں، یہ پیغمبرؐ کی برکت سے ہیں، کیونکہ پیغمبر اپنی امت کے احساسات اور حالات کا اصل منبع ہوتا ہے۔ جیسے کہ استاد و شاگرد اور باپ بیٹے

میں مناسبت ہوتی ہے، تو حضورؐ کی جو امت ہے، خواہ امت اجابت یعنی مسلمان ہیں یا امت دعوت ہے جس میں تمام عالم کے کفار بھی شامل ہیں۔ اُن سب میں حضورؐ کے بعد علم کی شان غالب ہوگئی امت اجابت میں حقیقی معنوں میں کہ جو دینی اور اخروی علوم ہیں اُس کی نظیر دیگر امتوں میں نہیں مل سکتی۔ اس طرح دیگر اقوام کو سائنیسی اور مادی علوم میں اسلام آنے کے بعد جو ترقی ہوئی وہ پہلے نہ تھی۔ غرض جو بھی علم دنیا میں پھیل رہا ہے اس کا مظہر اتم حضورؐ کو بنا دیا گیا تھا۔ اور جب امت علماً و عقلاً اکمل و مکمل ہے اور زمانہ علم کے عروج اور انتشار کا تھا تو حضورؐ کو جو وحی یعنی کتاب دی گئی وہ بھی جامع اور کامل ہے۔ اور جب قیامت تک حضورؐ کی نبوت باقی ہے تو اس وحی کو بھی خدا نے ہر قسم کی تبدیلی سے محفوظ کر دیا کہ کسی دشمن اور مخالف کی سیہ کاریوں سے اس میں باطل کی ملاوٹ نہیں ہو سکتی، قیامت تک اس کے الفاظ اور معانی و مطالب محفوظ رہیں گے لا یاتیہ الباطل۔ سارا امریکہ اور برطانیہ بھی کسی کی پشت پر کھڑا ہو اور وہ ایک ایک مجلس میں قرآن کے خلاف لاکھوں روپے خرچ کریں، پھر بھی نہ اس میں کچھ داخل کر سکتے ہیں۔ اور نہ اس سے کچھ گھٹا سکتے ہیں۔ قرآن کی حفاظت ہمارے ذریعہ سے نہیں بلکہ ہم خود اس کے ذریعہ سے محفوظ ہیں۔ اور اگر ہم نے اسے چھوڑ دیا تو خدا یہ نعمت ہم سے چھین کر اوروں کو دے دیگا، اور ہم محروم رہ جائیں گے ...... خداوند کریم ہمیں صحیح معنوں میں اس پر عمل کرنے اور اسکی خوشی منانے اور اس نعمت کا شکریہ ادا کرنے کی توفیق دے۔ آمین

اسلام کا نظامِ تقسیمِ دولت

قسطِ ثانی

گذشتہ سے پیوستہ

اسلام کے نظریۂ تقسیمِ دولت کے مذکورہ امتیازات میں سب سے بڑا اور بنیادی امتیاز یہ ہے کہ اس نے آجر اور سرمایہ کی تفریق ختم کر دی ہے جس کے نتیجے میں تقسیمِ دولت کے تین مد قرار پاتے ہیں۔ منافع، اجرت اور کرایہ چوتھے مد یعنی سود کو ناجائز قرار دے دیا گیا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں "آجر" کی سب سے بڑی خصوصیت جس کی بنا پر اسے "منافع" کا مستحق قرار دیا گیا ہے، یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ کاروبار کے نفع ونقصان کا خطرہ برداشت کرتا ہے۔ گویا سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر سے "منافع" اسکی اس ہمت کا صلہ ہے۔ کہ اس نے ایک ایسی کاروباری مہم کا آغاز کیا جس میں اگر نقصان ہو جائے تو وہ تن تنہا اس پر پڑے گا۔ باقی تینوں عوامل پیداوار میں سے سرمایہ کو معین سود، زمین کو معین لگان اور محنت کو معین اُجرت مل جاتی ہے۔ اس لئے وہ نقصان سے بری ہیں۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ درحقیقت "نقصان کا خطرہ مول لینے" کی یہ صفت خود سرمایہ میں موجود ہونی چاہئے۔ اس خطرے کا بار کسی اور پر نہیں ڈالا جا سکتا۔ جو شخص کسی کاروبار میں اپنا سرمایہ لگانا چاہتا ہے اسی کو یہ خطرہ مول لینا پڑے گا۔ اس لئے جو سرمایہ دار ہے وہی خطرہ مول لینے کے لحاظ سے آجر بھی ہے۔ اور جو شخص آجر ہے وہی سرمایہ دار بھی ہے۔

اب سرمایہ کے کسی کاروبار میں لگنے کی تین صورتیں ہیں :-

۱۔ انفرادی کاروبار | سرمایہ لگانے والا بلا شرکتِ غیرے خود ہی کاروبار بھی چلاتے۔ اس صورت

میں اس کو جو صلہ ملے گا وہ خواہ عرفی اور قانونی اعتبار سے صرف "منافع" کہلاتے۔ لیکن معاشی اصطلاح کے مطابق وہ صلہ دو چیزوں کا مجموعہ ہوگا۔ سرمایہ لگانیکی وجہ سے "منافع" کا اور کاروبار چلانے کی محنت کے لحاظ سے اجرت کا۔

۲۔شرکت | دوسری صورت یہ ہے کہ کئی آدمی مل کر سرمایہ لگائیں کاروبار چلانے میں بھی سب شریک ہوں اور نفع ونقصان میں بھی اسے فقہی اصطلاح میں "شرکت العقود" کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی معاشی اصطلاح کے مطابق تمام شرکا، سرمایہ لگانے کی حیثیت سے "منافع" کے حقدار ہوں گے اور کاروبار چلانے کی حیثیت سے "اجرت" کے۔ یہ صورت بھی اسلام نے جائز قرار دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل تجارت کا یہ طریقہ رائج تھا۔ آپ نے لوگوں کو اس پہ برقرار رکھا۔ اور اس کے جواز پر اجماع منعقد ہوگیا[1]۔

۳۔مضاربت۔ | تیسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص سرمایہ لگائے۔ اور دوسرا کاروبار چلائے اور نفع میں دونوں شریک ہوں' اسے فقہی اصطلاح میں "مضاربت" کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں معاشی اصطلاح کے مطابق سرمایہ لگانے والے (رب المال) کو اس کا حصہ "نفع" کی صورت میں ملے گا اور کاروبار چلانے والے (مضارب) کو "اجرت" کی صورت میں۔ ہاں اگر کاروبار میں نقصان ہو جائے تو جسطرح رب المال کا سرمایہ بیکار گیا۔ اسی طرح مضارب کی محنت بیکار رہی۔
یہ صورت بھی اسلام میں جائز ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ کے ساتھ نکاح سے قبل یہی معاملہ فرمایا تھا[2] اس کے بعد اس کے جواز پر بھی فقہائے امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے[3] ان تین صورتوں کے سوا کاروبار میں سرمایہ کے شریک ہونے کی اسلام میں کوئی اور صورت نہیں ہے۔

سود کا کاروبار | شغل سرمایہ کی چوتھی صورت جو غیر اسلامی معاشروں میں شروع سے رائج چلی آتی ہے، سود کا کاروبار ہے۔ یعنی ایک شخص سرمایہ بطور قرض دے، دوسرا محنت کرے، نقصان ہو تو محنت کا ہو اور سرمایہ کا سود ہر صورت میں کھرا رہے، اسکو اسلام نے حرام قرار

---

[1] ملاحظہ ہو المبسوط للسرخسی ص ۱۵۱ ج ۱۱ مطبع السعادۃ مصر۔

[2] زرقانی شرح المواہب ص ۱۹۸ ج ۱ الازہریہ مصر ۱۳۲۵ھ۔

[3] المبسوط للسرخسی ص ۱۸ ج ۲۲

دیا ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا ذروا ما بقی	اے ایمان والو! سود میں سے جو کچھ باقی رہ گیا
من الربوا ان کنتم مومنین	ہو اسے چھوڑ دو، اگر تم مومن ہو، پس اگر تم ایسا
فان لم تفعلوا فأذنوا بحرب	نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے
من اللہ ورسولہ۔	اعلانِ جنگ سن لو۔

اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ بھی ارشاد فرمادیا ہے کہ:

فان تبتم فلکم رؤس اموالکم	پس اگر تم (سود سے) توبہ کرو تو تمہیں تمہارے
لا تَظلِمون ولا تُظلَمون۔	اصل اموال مل جائیں گے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو۔ نہ
	کوئی تم پر ظلم کرے۔

ان دو آیتوں میں "مابقی من الربوا" اور "فلکم رؤس اموالکم" کے الفاظ نے پوری وضاحت کیساتھ یہ بات صاف کردی ہے کہ سود کی ادنیٰ سے ادنیٰ مقدار کا باقی رہنا بھی اللہ کو گوارا نہیں ہے اور سود کو چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ قرض دینے والے کو صرف "راس المال" واپس ملے، لہٰذا اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ اسلام کی نظر میں صفر کے سوا سود کی ہر شرح نامعقول ہے۔

جاہلیت میں بعض قبائل عرب دوسرے قبیلوں سے سود پر قرض لے کر کاروبار کرتے تھے۔ اسلام نے ان تمام معاملات کو یکسر موقوف کردیا۔ ابن جریرؒ فرماتے ہیں:

کانت بنو عمرو بن عمر بن عوف یاخذون	جاہلیت میں بنو عمرو بن بنو المغیرہ سے سود لیا کرتے
الربا من بنی المغیرۃ وکانت بنو المغیرۃ یربون	تھے۔ اور بنو المغیرہ انہیں سود دیتے تھے جب
لھم فی الجاھلیۃ فجاء الاسلام ولھم علیھم	اسلام آیا تو ان کا ان پر بہت سارا مال واجب
مال کثیر۔	تھا۔

اور

کان بنو المغیرۃ یربون لثقیف[1] بنو مغیرہ بنو ثقیف کو سود دیا کرتے تھے۔

واضح رہے کہ قبائل عرب کی حیثیت مشترکہ کمپنیوں کی سی تھی جو افراد کے مشترکہ سرمایہ سے کاروبار کرتی تھیں۔ اس لئے ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے کا اجتماعی طور پر قرض لینا عموماً کاروبار کے لئے ہوتا تھا۔ اور اسکو بھی قرآن کریم نے ممنوع قرار دے دیا۔

---

[1] تفسیر الدر المنثور بحوالہ ابن جریر ص ۳۳۶ ج اول۔

غرض اسلامی نظام معیشت میں جو شخص کسی کاروباری آدمی کو اپنا روپیہ کاروبار میں لگانے کیلئے دینا چاہتا ہے اسے پہلے یہ متعین کرنا پڑے گا کہ وہ روپیہ کاروبار کے نفع میں خود حصہ دار ہونے کے لئے دے رہا ہے۔ یا وہ اس روپیہ سے اس کاروباری آدمی کی امداد کرنا چاہتا ہے۔ اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ روپیہ دیگر کاروبار کے نفع سے مستفید ہو تو اسے "شرکت" یا "مضاربت" کے طریقوں پر عمل کرنا پڑے گا۔ یعنی اسے کاروبار کے نفع ونقصان کی ذمہ داری بھی اٹھانی پڑے گی۔ کاروبار کو نفع ہوا تو وہ نفع میں شریک ہوگا۔ اور اگر کاروبار کو خسارہ ہوا تو اسے خسارے میں بھی حصہ دار ہونا پڑے گا۔

اور اگر وہ روپیہ دوسرے کی امداد کی غرض سے دے رہا ہے تو پھر ضروری ہے کہ وہ اس امداد کو امداد ہی سمجھے۔ اور "نفع" کے ہر مطالبہ سے دستبردار ہو جائے، وہ صرف اتنے ہی روپے کی واپسی کا مستحق ہوگا جتنے اس نے قرض دیئے تھے۔ اسلام کی نظر میں اس ناانصافی کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ وہ اپنے "سود" کی ایک شرح معین کر کے نقصان کا سارا بوجھ مقروض پر ڈال دے۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ اسلام میں "نقصان کا خطرہ مول لینے" کی ذمہ داری "سرمایہ" پر ہے۔ جو شخص کاروبار میں سرمایہ لگائیگا اسے یہ خطرہ ضرور مول لینا پڑے گا[1] لہذا اگر "آجر" کی بنیادی خصوصیت یہ ہے (جیسا کہ بیشتر ماہرین معاشیات کا خیال ہے) کہ وہ "خطرہ مول لیتا ہے" تو یہ خصوصیت اسلام کی نظر میں درحقیقت "سرمایہ" کی ہے۔ اس لئے اسلامی نظام معیشت میں سرمایہ اور آجر ایک ہی چیز ہو جاتے ہیں اور تقسیم دولت میں ان کا حصہ منافع ہے، نہ کہ سود۔

اور اگر "آجر" کی بنیادی خصوصیت یہ سمجھی جائے کہ وہ تنظیم اور منصوبہ بندی کرتا ہے (جیسا کہ بعض ماہرین معاشیات کا خیال ہے۔) تو پھر یہ کام "محنت" میں داخل ہے۔ اور اسے الگ عامل پیداوار سمجھنا طول لاطائل ہے۔

کرایہ اور سود کا فرق | مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اسلام کی رو سے منافع اور اُجرت جائز ہے۔ اور سود ناجائز۔ اب چوتھی چیز "کرایہ" رہ جاتی ہے۔ اسلام نے اسے

---

[1] اگر کسی شخص نے قرض حسن لیکر کاروبار میں سرمایہ لگایا ہے اور واپس کیا تو شرکت یا مضاربت کا معاملہ نہیں کیا تو قرض لینے کے بعد مدیون خود اس روپے کا مالک ہو گیا اب وہ خود سرمایہ دار کی حیثیت سے روپیہ لگا رہا ہے۔ اس لئے نقصان کی ذمہ داری بھی اس پر ہوگی۔

بھی جائز قرار دیا ہے۔ بعض حضرات کو یہاں یہ اشکال ہونے لگتا ہے کہ جب سرمایہ پر سود کا لین دین معین ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے تو زمین کا کرایہ (واضح رہے کہ ہماری اصطلاح میں زمین کے اندر مشینری وغیرہ بھی داخل ہے) کیوں جائز ہے جبکہ وہ بھی معین ہوتا ہے۔

اس سوال کے جواب کیلئے پہلے یہ سمجھنا چاہیئے کہ معیشت کے مادی وسائل دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جنہیں استعمال کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے انہیں خرچ کرنا نہیں پڑتا، بلکہ وہ اپنا وجود برقرار رکھتے ہوئے فائدہ دیتے ہیں۔ مثلاً زمین، مشینری، فرنیچر، سواری وغیرہ کہ ان کے وجود کو باقی رکھتے ہوئے ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ ان سے مستفید ہونے کے لئے انہیں خرچ یا فنا کرنا نہیں پڑتا۔ ایسی چیزیں چونکہ بذات خود قابل استفادہ ہوتی ہیں۔ اور ان کے بہت سے فوائد وہ ہیں جنہیں حاصل کرنے کے لئے کرایہ پر لینے والے کو ذرہ برابر محنت نہیں کرنی پڑتی۔ دوسری طرف ان کے استعمال سے ان کی قدر گھٹتی ہے۔ اس لئے ان کے منافع کی اُجرت کا لین دین بالکل معقول اور درست ہے۔ اور اس "منافع" کی اُجرت کا لین دین بالکل معقول اور درست ہے۔ اور اس "منافع" کی اُجرت کو اسلام "کرایہ" کہتا ہے۔

اس کے برخلاف نقد روپیہ وہ چیز ہے جس سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے اسے خرچ یا فنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سے کسی قسم کا فائدہ اس وقت نہیں اٹھایا جا سکتا جب تک کہ اس سے کوئی چیز خریدی نہ جائے۔ لہٰذا روپیہ چونکہ بذات خود قابل استفادہ نہیں ہوتا۔ اس لئے ایک طرف اس سے جس قسم کا فائدہ بھی مقروض اٹھانا چاہئے اسے خرچ کر کے خود کچھ عمل کرنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف مقروض کے استعمال کی وجہ سے روپیہ کی قدر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس لئے اس پر کوئی معین "شرح سود" مقرر کرنے میں کوئی معقولیت نہیں ہے۔ روپیہ کے مالک کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو قرض نہ دے۔ یا چاہے تو اس کے ذریعہ روپے کے حاجتمند کے ساتھ شرکت و مضاربت کا کاروبار کرے۔ لیکن اگر وہ قرض دیتا ہے تو اس پر معین "شرح" سے سود لینے کی اسلام اجازت نہیں دے سکتا۔

اسی بناء پر ہم نے یہ اصطلاح مقرر کی ہے کہ جو چیزیں بذات خود خرچ کئے بغیر قابل استفادہ نہیں ہوتیں وہ "سرمایہ" کہلائیں گی اور جب وہ عامل پیداوار کی حیثیت سے کاروبار میں شریک ہوں گی تو "منافع" کی مستحق ہوں گی اور جو چیزیں خرچ کئے بغیر قابل استفادہ ہوتی ہیں وہ "زمین" کہلائیں

گی اور عمل پیدائش میں حصہ دار ہونے کی وجہ سے انہیں "کرایہ" کی صورت میں دولت تقسیم کی جائیگی۔

حرمت سود کا اثر تقسیم دولت پر مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ اسلام اور سرمایہ داری کے نظام تقسیم دولت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشیات میں "سود" جائز ہے اور اسلام میں ناجائز۔ اب مختصراً اس پہلو پر نظر ڈال لینا بھی مناسب ہوگا کہ حرمت سود کے معاشی اثرات کیا ہیں۔

یوں تو "سود" کی حرمت سے "پیدائش دولت" کے نظام پر بھی بڑے گہرے دوررس اور مفید اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس لئے یہاں اس کے صرف ان اثرات کی طرف مجمل اشارے عرض کئے جاتے ہیں جو "تقسیم دولت" کے نظام پر مرتب ہوتے ہیں۔ حرمت سود کا ایک سادہ اثر تو یہ ہے کہ اسکی وجہ سے تقسیم دولت کے نظام میں توازن اور ہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ سودی نظام معاشیات کا یہ خاصہ لازمہ ہے کہ اس میں ایک فریق (سرمایہ) کا نفع تو متعین صورت میں بہر حال کھرا رہتا ہے۔ لیکن اس کے مقابل دوسرے فریق (محنت) کا نفع مشتبہ اور موہوم رہتا ہے۔ وسیع پیمانے کی تجارتیں خواہ کتنی ہی نفع بخش کیوں نہ ہو جائیں۔ لیکن انہیں بہر حال "خطرے" سے خالی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ جہاں موجودہ وسائل معیشت کی فراوانی سے بڑے پیمانے کی تجارتوں کے خطرات کم ہوئے ہیں، وہاں کچھ خارجی عوامل کی بناء پر ان میں اضافہ بھی ہوا ہے۔ اور تجارت جتنے بڑے پیمانے کی ہوتی ہے۔ یہ خطرات بھی اتنے ہی شدید ہو جاتے ہیں۔ اس لئے سرمایہ دارانہ معیشت میں تقسیم دولت کا توازن نہایت ناہموار ہو جاتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قرض لینے والے کو سخت نقصان اٹھانا پڑا لیکن قرض دینے والے کی تجوری بھرتی ہی چلی گئی، اور کبھی اس کے برعکس یہ ہوتا ہے کہ آجر کو بے انتہا منافع ہوا اور سرمایہ دینے والے کو اس میں سے بہت معمولی سا حصہ مل سکا۔

اس کے برخلاف اسلامی نظام میں چونکہ سود حرام ہے اس لئے موجودہ دنیا میں عموماً شغل سرمایہ کی صرف دو صورتیں ہوں گی۔ شرکت اور مضاربت۔ اور یہ دونوں صورتیں تقسیم دولت کی اس غیر منصفانہ ناہمواری سے خالی ہیں۔ ان صورتوں میں نقصان ہوتا ہے۔ تو فریقین کو ہوتا ہے۔ اور نفع ہوتا ہے تو دونوں فریق متناسب طریقے سے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ "ارتکاز دولت" جو سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بدترین خرابی ہے۔ اس طریقے کی بدولت اسکی بڑی حد تک مؤثر روک تھام ہو جاتی ہے۔ اور دولت کا ذخیرہ چند ہاتھوں میں سمٹنے کی بجائے معاشرے کے افراد

میں اسطرح پھیلتا ہے کہ اس سے کسی شخص پر کوئی ظلم نہیں ہو پاتا۔ وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں ارتکازِ دولت کی ایک بہت بڑی وجہ "سود" ہے۔ اس کی وجہ سے مٹھی بھر سرمایہ دار نہ صرف یہ کہ دولت کے بڑے خزانے پر قابض ہو جاتے ہیں، بلکہ وہ پورے بازار پر بھی پوری خودغرضی کے ساتھ حکمرانی کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں "رسدِ اشیاء" اور قیمتوں" کا نظام بھی قدرتی رہنے کی بجائے مصنوعی ہو جاتا ہے۔ اور معیشت و اخلاق سے لیکر ملکی سیاست تک زندگی کا کوئی گوشہ اس کے برے اثرات سے محفوظ نہیں رہتا۔

اسلام نے "سود" کو ممنوع قرار دے کر ان تمام خرابیوں کی بنیاد کو منہدم کر دیا ہے اسلامی نظام میں ہر روپیہ لگانے والا کاروبار اور اسکی پالیسی میں شریک ہوتا ہے۔ نفع و نقصان کی ذمہ داریاں بھی اٹھاتا ہے۔ اور اسطرح اسکی کاروباری مرضی بے لگام نہیں ہونے پاتی۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ یہاں ایک شبہ کا ازالہ کر دینا مناسب ہوگا۔ "سود" کے بارے میں جو یہ کہا گیا ہے کہ اسکی وجہ سے تقسیم دولت میں ناہمواری پیدا ہوتی ہے اور فریقین میں سے کوئی نہ کوئی اس سے متاثر ہوتا ہے۔ اس پر بعض حضرات کے دل میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ سودی کاروبار میں جس شخص کو بھی نقصان پہنچتا ہے وہ اسکی مرضی سے پہنچتا ہے۔ اور جب وہ خود یہ خطرہ مول لینے پر راضی ہے تو اس میں قانونِ شریعت کیوں دخل انداز ہوتا ہے۔

حالانکہ ذرا سا غور کیا جائے تو اس کا جواب سمجھنا کوئی مشکل نہیں۔ اسلامی نظام زندگی کا معمولی سا مطالعہ بھی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اسلام میں فریقین کی باہمی رضامندی ہمیشہ کسی معاملے کی وجہ جواز نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو جانے پر راضی ہو تو یہ بات قاتل کو بری نہیں کر سکتی۔ یہاں تک کہ "زنا" جسے مغربی تہذیب کی تنگ نظری نے خالص نجی زندگی کا مسئلہ سمجھا ہوا ہے۔ اس میں بھی فریقین کی رضامندی مجرموں کو بری نہیں کر سکتی۔

دولت کی تقسیم اور معاشی نظام کی بہبود کا معاملہ تو اس سے کچھ آگے ہی ہے۔ شروع میں قرآن کریم کے حوالوں سے عرض کیا جا چکا ہے کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے اور اس نے انسان کو جو ملکیت عطا کی ہے وہ آزاد اور بے لگام ہونے کی بجائے اصولوں کی پابند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ معاملہ جو اسلام کی نظر میں فی نفسہ غیر منصفانہ ہے۔ یا جس کا اثر معاشرے کی اجتماعی بہتری پر پڑ سکتا ہے۔ اس میں اسلام نے فریقین کی رضامندی کو وجہ جواز قرار نہیں دیا۔ احادیث میں فریقین کی رضامندی کے باوجود جو "تلقی الجلب، بیع الحاضر للباد، محاقلہ، مزابنہ اور

مخابرہ ــــــ وغیرہ کی شدید ممانعت آتی ہے اس کے پیچھے بھی حکمت کارفرما ہے۔ اس لئے "سود" کے معاملے کو بھی محض اس بنا پر جائز قرار نہیں دیا جاسکتا کہ فریقین اس پر رضامند ہیں۔

جاہلیت کے لوگ حرمت سود پر اسی قسم کا اعتراض کیا کرتے تھے کہ:

انما البیع مثل الربوا۔ بیع ربا ہی کی طرح تو ہے۔

قرآن کریم نے مختصر لفظوں میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ:

واحل اللہ البیع وحرم الربوا۔ اور اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام۔

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالی نے ان کے اعتراض کے جواب میں "حرمت سود" کی کوئی حکمت اور مصلحت نہیں بیان فرمائی، بلکہ صرف یہ فرمایا ہے کہ جب اللہ نے بیع کو حلال اور ربوا کو حرام کر دیا ہے۔ تو خواہ اسکی مصلحت تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اس حکم کو ماننا پڑے گا۔ یہاں قرآن کریم نے حکمتوں کو بیان فرمانے کی بجائے حاکمانہ اسلوب اختیار فرمایا ہے۔ جس سے حرمت سود پر ہر قسم کے اعتراض کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سود کی حرمت اسلام کا وہ حکیمانہ فیصلہ ہے جسکی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بہت سی خرابیاں بھی دور ہو جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد اشتراکیت کے مستبد اور غیر فطری نظام معیشت کو اختیار کرنے کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہی وہ اعتدال کی راہ ہے، جو موجودہ دنیا کو افراط و تفریط سے نجات دلا کر ایک متوازن اور منصفانہ نظام معیشت کی طرف رہنمائی کرسکتی ہے۔ فرانسیسی پروفیسر لوئی ماسین نون نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ:

"سرمایہ داری اور اشتراکیت کے تصادم میں اسی تمدن اور تہذیب کا مستقبل محفوظ اور درخشاں رہے گا جو سود کو ناجائز قرار دیکر اس پر عمل بھی کرا رہا ہو[۱]"

اجرتوں کا مسئلہ یہاں تک تقسیم دولت کے معاملے میں اسلام اور سرمایہ داری کا ایک بنیادی فرق واضح ہوا ہے اور وہ ہے مسئلہ سود۔ اس کے بعد ان دونوں کے درمیان ایک اور فرق کو ذہن میں رکھنا بھی ضروری ہے جو آجر اور اجیر کے رشتے سے متعلق ہے اور جس میں اجرتوں کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے۔

---

[۱] ڈاکٹر یوسف الدین۔ اسلام کے معاشی نظریئے ص ۲۰۸ ج ۲ بحوالہ ڈاکٹر حمید اللہ انجمن ہائے قرضہ حسنہ کی اہمیت مجلہ طیلسانیین عثمانیہ ج ۷ حصہ معاشیات ج ۲ ۱۹۴۳ء

سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف موجودہ دنیا میں جو شدید ردعمل ہوا ہے اسکی بہت بڑی وجہ آجر اور اجیر کے جھگڑے اور اجرتوں کی تعیین کے مسائل تھے۔ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بنیاد ہی چونکہ خود غرضی اور بے لگام انفرادی ملکیت پر ہے۔ اس لیئے اس نظام میں آجر اور اجیر کے درمیان "رسد و طلب" کا ایک ایسا خشک، کھردرا اور رسمی تعلق ہے جسکی بنیاد خالص خود غرضی پر استوار ہوئی ہے۔ آجر صرف اس حد تک اجیر کی انسانیت کا احترام کرتا ہے۔ جب تک وہ اپنے کاروبار کے لئے اس کے ہاتھوں مجبور ہے۔ لہذا جہاں یہ مجبوری ختم ہو جاتی ہے وہاں وہ اس پر اپنے ظلم کا شکنجہ کس دیتا ہے۔ دوسری طرف اجیر صرف اس وقت تک آجر کے کام اور اس کے احکام سے دلچسپی رکھتا ہے۔ جب تک اس کا روزگار کسی آجر پر موقوف ہو۔ لہذا جہاں اسکی یہ مجبوری ختم ہو جاتی ہے وہاں وہ کام چوری اور ہڑتال سے نہیں چوکتا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مزدور اور سرمایہ دار میں ایک ہی کشمکش قائم رہتی ہے۔ اور دونوں کے درمیان کوئی صحت مند رابطہ قائم نہیں ہو پاتا۔

اس کے برخلاف اسلام نے اگرچہ آجر اور اجیر کے درمیان رسد اور طلب کے نظام کو ایک حد تک تسلیم کیا ہے، لیکن ساتھ ہی محنت کی رسد اور طلب دونوں پر کچھ ایسی پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ ان کا باہمی رابطہ ایک خشک رسمی تعلق نہیں رہا۔ بلکہ بڑی حد تک بھائی چارہ بن گیا ہے۔ آجر کا نقطۂ نظر اجیر کے بارے میں کیا ہونا چاہیئے، اسکو قرآن کریم نے حضرت شعیب علیہ السلام کا ایک مقولہ نقل فرماتے ہوئے مختصر لفظوں میں واضح فرما دیا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے "آجر" تھے۔ انہوں نے فرمایا:

وما ارید ان اشق علیک ستجدنی انشاء اللہ من الصالحین۔	میں تم پر (غیر ضروری) مشقت ڈالنا نہیں چاہتا۔ خدا نے چاہا تو تم مجھے نیکوکار پاؤ گے۔

اس آیت نے واضح فرما دیا کہ ایک مسلمان آجر جس کی اصلی منزل مقصود "صالح" ہونا ہے، اس وقت تک "صالح" نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے اجیر کو غیر ضروری مشقت سے بچانے کا داعیہ نہ رکھتا ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو مزید واضح الفاظ میں اسطرح کھول دیا ہے کہ

ان اخوانکم خولکم جعلھم اللہ تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل ولیلبسہ	تمہارے بھائی تمہارے خادم ہیں، جنہیں اللہ نے تمہارے زیر دست کیا ہے۔ لہذا جس شخص کا بھائی اس کا ماتحت ہو اسے چاہیئے کہ وہ جو

مما یلبس ولا تکلفوھم ما یغلبھم فان کلفتموھم ما یغلبھم فأعینوھم۔ [1]

خود کھائے اس میں سے اسکو بھی کھلائے، اور جو خود پہنے اس میں سے اسکو بھی پہنائے اور ان پر کسی ایسے کام کا بوجھ نہ ڈالو جو ان کی طاقت سے زیادہ ہو۔ اور اگر کسی ایسے کام کا بوجھ ڈالو تو خود ان کی مدد کرو۔

نیز ارشاد فرمایا کہ:

اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ۔ [2]

مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو۔

اسی طرح آپ کا ارشاد ہے کہ تین شخص ایسے ہیں جن کا میں قیامت کے دن دشمن ہوں گا، ان میں سے ایک وہ ہے کہ:

رجل استاجر اجیرا فاستوفی منہ ولم یعطہ اجرہ [3]

وہ شخص جو کسی مزدور کو اجرت پر لے۔ پھر اس سے کام پورا لیلے اور اسکو اسکی اجرت نہ دے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مزدوروں کے حقوق کا کس قدر احساس تھا۔ اس کا اندازہ حضرت علیؓ کی ایک روایت سے ہوتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ وفات سے قبل آپؐ کے آخری الفاظ یہ تھے:

الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم۔ [4]

نماز کا خیال رکھو اور ان لوگوں (کے حقوق) کا جو تمہارے زیر دست ہیں۔

ان ہدایات کے نتیجے میں "مزدور" کو اسلامی معاشرے میں جو باوقار اور برادرانہ مقام حاصل ہوا اسکی بیشمار مثالیں قرون اولیٰ کی اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں۔ اور پورے وثوق اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ "مزدور" کے حقوق کی رعایت اس سے بہتر طریقے پر ممکن ہی نہیں ہے۔

دوسری طرف اسلام نے "آجر" کو بھی کچھ احکام کا پابند بنا کر آجر سے اس کے تعلقات

---

[1] صحیح بخاری کتاب العتق ص ۳۴۶ ج اول۔

[2] ابن ماجہ وطبرانی عن ابن عمر (جمع الفوائد ص ۲۵۶ ج اول میرٹھ ۱۳۴۵ھ۔

[3] صحیح بخاری کتاب الاجارہ بروایت ابوہریرہ ص ۳۰۲ ج اول۔

[4] ابن ماجہ (جمع الفوائد ص ۲۶۴ ج اول)

کو مزید خوشگوار کر دیا ہے۔ مزدور آجر کے جس کام کی ذمہ داری اٹھاتا ہے، اسلامی نقطہ نظر سے وہ ایک ایسا معاہدہ کرتا ہے جسکی پابندی اسے صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لئے نہیں کرنی ہے بلکہ اسکی اصل منزل مقصود یعنی آخرت کی بہتری بھی اس پر موقوف ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

یاایھا الذین امنوا اوفوا بالعقود۔	اے ایمان والو تم اپنے معاہدوں کو پورا کرو۔

اور ارشاد ہے:

ان خیر من استاجرت القوی الامین۔	بہترین اجیر وہ ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی۔

نیز ارشاد ہے:

ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون۔ ...	دردناک عذاب ہے ان ناپ تول میں کمی کرنیوالوں کیلئے جو اپنا حق لینے کے وقت پورا پورا وصول کریں اور جب انہیں ناپ یا تول کر دینے کا موقعہ آئے تو کمی کر جائیں

فقہائے امت کی تصریحات کے مطابق اس آیت میں "مطففین" یا ناپ تول میں کمی کرنیوالے کے مفہوم میں وہ مزدور بھی داخل ہے جو طے شدہ اجرت پوری وصول کرنے کے باوجود کام چوری کا مرتکب ہو۔ اور اپنے جو اوقات اس نے آجر کو بیچ دئے ہیں انہیں آجر کی مرضی کے خلاف کسی اور کام میں صرف کرے۔ اس لئے ان احکام نے "کام چوری" کو گناہ عظیم قرار دے کر اجیر کو بھی یہ جتلا دیا ہے کہ جس آجر کا کام کرنا اس نے قبول کیا ہے، اسکی ذمہ داری اٹھا لینے کے بعد اب وہ خود اس کا اپنا کام بن گیا ہے۔ اور اس کے ذمے ضروری ہے کہ وہ پوری دیانتداری، مستعدی اور لگن کے ساتھ اسے انجام دے، ورنہ وہ آخرت کی اس بہتری کو حاصل نہ کر سکے گا جو اس کا اصل منتہائے مقصود ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے اجرتوں کے مسئلے میں رسد و طلب کے نظام کو ایک حد تک تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ آجر اور اجیر دونوں کیلئے کچھ ایسے احکام دیدئے ہیں کہ ان کی وجہ سے رسد و طلب کا یہ نظام خود غرضی کی بجائے اخوت و ہمدردی پر مبنی ہو گیا ہے۔

ہو سکتا ہے یہاں کسی صاحب کو یہ شبہ پیدا ہو کہ آجر اور اجیر دونوں پر پابندیاں عائد کرنے

کے لئے قرآن و سنت نے جو احکام دیئے ہیں انکی حیثیت اخلاقی ہدایات کی سی ہے۔ جو ٹھیٹھ معاشی اور قانونی نقطۂ نظر سے خارج از بحث ہیں۔ لیکن یہ اعتراض اسلام کے مزاج کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہوگا۔ یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اسلام محض ایک معاشی نظام ہی نہیں ہے، بلکہ وہ زندگی کا ایک مکمل دستور العمل ہے جس میں زندگی کے تمام شعبے باہم مربوط رہ کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں ان میں سے کسی ایک شعبے کو دوسرے تمام شعبوں سے کاٹ کر سمجھنے کی کوشش لازماً غلط فہمیاں پیدا کرے گی۔ اس کے ہر شعبے کا صحیح اس وقت سامنے آسکتا ہے۔ جب اسے اس کے مجموعی نظام زندگی میں فٹ کر کے دیکھا جائے۔ اس لئے اسلامی معاشیات کی بحث میں ان اخلاقی ہدایات کو خارج از بحث قرار نہیں دیا جاسکتا۔

پھر اسلام کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اگر ذرا وسیع نظر سے دیکھا جائے تو اسکی اخلاقی ہدایات بھی درحقیقت قانونی احکام ہیں اس لئے کہ ان پر بالآخر آخرت کی جزا و سزا مرتب ہوتی ہے جسکو ایک مسلمان کی زندگی میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ "عقیدہ آخرت" ہی وہ چیز ہے جس نے نہ صرف یہ کہ اخلاق کو قانون کا درجہ عطا کیا ہے، بلکہ اصطلاحی قوانین کی پشت پناہی بھی کی ہے۔۔۔ قرآن کریم کے اسلوب پر اگر آپ غور فرمائیں تو نظر آئے گا کہ اس کے ہر قانونی اور اخلاقی حکم کیساتھ "خوف خدا" اور "فکر آخرت" کے مضامین لگے ہوتے ہیں۔ اس میں اصلی راز یہی ہے کہ درحقیقت قانون کی پابندی محض انسانی ڈنڈے کے زور سے کبھی نہیں کرائی جاسکتی، تاوقتیکہ انسان کی ہر نقل و حرکت اور ہر فکر و عمل پر پہرہ دینے کیلئے "فکر آخرت" موجود نہ ہو۔ یوں تو دنیا کی ہزار سالہ طویل تاریخ جو پوری قانونی جکڑ بندیوں کے باوجود مظالم اور جرائم کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس ناقابل انکار حقیقت کی تصدیق کرتی ہے۔ لیکن خاص طور سے آج کی مہذب دنیا نے تو اسے روز روشن کی طرح عیاں کر دیا ہے۔ کہ جس رفتار سے قانونی منزلیں میں اضافہ ہو رہا ہے اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے جرائم بڑھ رہے ہیں۔

اس لئے یہ سمجھنا کہ "اجیر" اور آجر کے تعلقات محض قانونی جکڑ بندیوں سے درست ہوسکیں گے انتہا درجے کی خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔ اس کا اصلی علاج صرف اور صرف "فکر آخرت" ہے اور اسلام نے اس معاملے میں اس پر زیادہ زور دیا ہے۔

آج کا ذہن جو محض دنیوی زندگی کے الٹ پھیر میں الجھ کر مادے کے اس پار جھانکنے کی صلاحیت کھو چکا ہے۔ اس کے لئے شاید اس بات کو سمجھنا مشکل ہو لیکن یقین ہے کہ اگر امن و

سکونِ انسانیت کے لئے مقدر ہے تو وہ سینکڑوں ٹھوکریں کھاکر بالآخر اس حقیقت تک پہنچے گی جس کی طرف قرآنِ کریم نے بار بار توجہ دلائی ہے۔ جس زمانے میں اسلام ایک عملی نظام کی حیثیت سے اس دنیا میں کارفرما تھا۔ اس وقت دنیا اس قرآنی نظریئے کی صداقت کو خوب اچھی طرح دیکھ چکی ہے۔ اس دور کی تاریخ میں "آجر اور اجیر" کے جھگڑوں کی یہ کیفیت ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی جس نے کچھ عرصہ سے پوری دنیا کو تہ و بالا کیا ہوا ہے۔ قرآن و سنت کی یہی وہ اخلاقی ہدایات تھیں جنہوں نے اس مسئلے کا اطمینان بخش حل پیش کرکے دکھایا اور جنکی وجہ سے اسلام کے قرونِ اولیٰ کی تاریخ آجر کے جبر و تشدد اور اجیر کی ہڑتالوں سے تقریباً خالی نظر آتی ہے۔

تقسیم دولت کے ثانوی مدات

اب تک ہماری بحث تقسیم دولت کے اولین حقداروں سے متعلق تھی۔ اسلامی نظریۂ تقسیم دولت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے عاملین پیداوار کے ساتھ دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست دی ہے اور اس کا ایک باقاعدہ نظام بنایا ہے۔

مقالے کی تمہید میں اس بات کی طرف اشارے کئے جاچکے ہیں۔ کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے۔ وہی اس کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور اس نے انسان کو اس پر ملکیت کے حقوق عطا کئے ہیں۔ انسان کو اس کے کسب و عمل کا جبھی صلہ ملتا ہے۔ وہ اس کا مالک ضرور ہے۔ لیکن چونکہ کسب و عمل کی تمام تر توفیق اللہ ہی دیتا ہے۔ اور دولت کی تخلیق بھی اسی نے کی ہے۔ اس لئے انسان اپنی ملکیت کے استعمال میں قطعی طور پر خود مختار نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کے احکام کا پابند ہے۔ لہٰذا جس جگہ خرچ کرنے کا وہ حکم دیدے انسان کیلئے وہاں خرچ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اسی بنیادی نظریئے سے عمل پیدائش کے علاوہ استحقاق دولت کا ایک دوسرا مد خود بخود نکل آتا ہے۔ یعنی ہر وہ شخص اسلامی نقطۂ نظر سے دولت کا مستحق ہے۔ جس تک دولت کا پہنچانا اللہ نے دولت کے اولین مالکوں کے ذمے فرض قرار دیا ہے۔ اس طرح تقسیم دولت کے ثانوی مدات کی ایک طویل فہرست مرتب ہو جاتی ہے، جن میں سے ہر ایک دولت کا مستحق ہے۔

ان مدات کو مقرر کرکے اسلام درحقیقت یہ چاہتا ہے کہ دولت کو معاشرے میں

زیادہ سے زیادہ گردش دی جائے اور ارتکازِ دولت پر جو پابندیاں "سود" کی حرمت کے ذریعہ عائد کی گئی ہیں ان میں مزید توسیع دی جائے۔ ان مدات کا تفصیلی بیان تو اس مختصر مقالے میں ممکن نہیں ہے۔ تاہم انہیں اختصار کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے۔

۱۔ زکوٰۃ | ان میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ وسیع مد "زکوٰۃ" ہے۔ قرآن کریم نے بیشمار مقامات پر اس فریضے کو "نماز" کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ہر وہ شخص جو سونے چاندی مویشی اور مالِ تجارت کا مقدار نصاب کی حد تک مالک ہو۔ اس کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ کہ وہ سال گذرنے پر اپنی ان مملوکات کا ایک حصّہ دوسرے ضرورت مند افراد پر صرف کرے۔ اور جو شخص اس فریضے کو ادا نہ کرے اس کے لئے قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ :

الذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔ یوم یُحمٰی علیھا فی نارجہنم فتکوی بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم ھذا ما کنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون۔	جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کر رکھتے ہیں۔ اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انکو آپ دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔ جس دن اس (دولت) کو جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا۔ پھر اس سے انکی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پشتوں کو داغا جائے گا۔ یہ وہ مال ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔ چکھو جسے تم جمع کیا کرتے تھے۔
....	

—— پھر اس زکوٰۃ کی ادائیگی کیلئے قرآن کریم نے آٹھ مصارف خود مقرر فرما دئے ہیں ——

اسی طرح "زکوٰۃ" کے اس ایک مد کیلئے آٹھ مصارف مقرر فرما کر قرآن کریم نے دولت کی زیادہ سے زیادہ گردش کا دروازہ کھول دیا ہے۔

"زکوٰۃ" کے مصارف میں استحقاق کی قدر مشترک "ناداری" اور "افلاس" ہے اور اس مد میں افلاس ہی کے خاتمے پر زور دیا گیا ہے۔ اس طریقے سے نادار اور مفلس افراد کے درمیان کس قدر وسیع پیمانے پر تقسیم دولت ممکن ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۵ء میں پاکستان کی قومی آمدنی تقریباً پندرہ ارب تیس کروڑ روپیہ تھی۔ زکوٰۃ کی ادنیٰ ترین شرح یعنی ۵ء۲ فی صد کے حساب سے اگر قومی آمدنی کی پوری زکوٰۃ نکالی جائے تو کم از کم اڑتیس کروڑ پچیس لاکھ روپیہ سالانہ صرف غریبوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر تمام عاملین

پیداوار ہر سال باقاعدگی کے ساتھ زکوٰۃ نکالیں تو سالانہ کتنی خطیر رقم سرمایہ داروں کی جیب سے نکل کر غریبوں اور ناداروں کے پاس پہنچتی ہے۔ اور اس طرح تقسیم دولت کی ناہمواری کتنی تیزی سے رفع ہو سکتی ہے۔

۲۔عشر | "عشر" درحقیقت زمینی پیداوار کی "زکوٰۃ" ہے۔ لیکن چونکہ اس پیداوار میں انسانی محنت کا دخل نسبتہً کم ہوتا ہے۔ اس لئے اسکی شرح ۲٫۵ فی صد کی بجائے ۱۰ فیصد رکھی گئی ہے۔ "عشر" صرف ان زمینوں کی پیداوار پر واجب ہوتا ہے۔ جو فقہی تفصیلات کے مطابق عشری ہوں اور اسکو زکوٰۃ ہی کے مصارف پر خرچ کیا جاتا ہے۔

۳۔کفارات | غریبوں تک دولت پہنچانے کا ایک مستقل راستہ اسلام نے کفارات کے ذریعہ مقرر کیا ہے۔ کوئی شخص بلا عذر رمضان کا روزہ توڑ دے۔ یا کسی مسلمان کو قتل کر دے یا اپنی بیوی سے ظہار کرنے یا قسم کھا کر اسے توڑ دے تو بعض صورتوں میں لازمی اور بعض صورتوں میں اختیاری طور پر اسے حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مال کا کچھ حصہ ناداروں پر خرچ کرے یہ نقد روپیہ کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے اور کھانے کپڑے کی صورت میں بھی۔

۴۔صدقۃ الفطر | اس کے علاوہ جو لوگ صاحب نصاب ہوں، ان کے لئے عید الفطر کے موقعہ پر لازم کیا گیا ہے کہ نماز عید کو جانے سے پہلے فی کس پونے دو سیر گندم یا اسکی قیمت مفلسوں، ناداروں، یتیموں اور بیواؤں پر خرچ کریں۔ یہ رقم نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے بھی نکالی جاتی ہے۔ اور اس کے وجوب کے لئے مقدار نصاب کا "نامی" ہونا یا اس پر پورا سال گزرنا بھی ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا اس طریقے سے ایک اجتماعی صورت کے موقع پر زیادہ سے زیادہ مساوات پیدا کی جا سکتی ہے۔

مذکورہ بالا چار مدات غریبوں اور مفلسوں میں دولت تقسیم کرنے کے لئے تھے۔ اس کے علاوہ دو مد وہ ہیں جن سے اعزہ و اقرباء کی امداد اور ان تک دولت کا پہنچانا مقصود ہے ان میں سے ایک مد نفقات کا ہے اور دوسرا وراثت کا۔

۵۔ تفقات | اسلام نے ہر انسان پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ اپنے خاص خاص رشتے داروں کی معاشی کفالت کرے۔ پھر ان میں سے بعض تو وہ ہیں جن کی کفالت بہر صورت واجب ہے۔ خواہ انسان تنگدست ہو یا خوشحال۔ مثلاً بیوی، نابالغ اولاد اور بعض وہ ہیں جن کی کفالت کی ذمہ داری وسعت کے ساتھ مشروط ہے۔ ایسے رشتے داروں کی ایک طویل

فہرست اسلامی فقہ میں موجود ہے۔ اور اس کے ذریعہ خاندان کے اپاہج کمزور افراد کی معاشی کفالت کا بڑا اچھا نظام بنایا گیا ہے۔

۶. **وراثت** | اسلام کا نظامِ وراثت اس کے نظریۂ تقسیمِ دولت میں ایک بنیادی امتیاز رکھتا ہے۔ وراثت کی مرتکز تقسیم سے تقسیمِ دولت میں جو ناہمواری پیدا ہوتی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ مغربی ممالک میں اس ناہمواری کا ایک بہت بڑا سبب یہی ہے۔ جسکا اقرار بہت سے ماہرینِ معاشیات نے کیا ہے۔

یورپ میں بالعموم اکبرالاولاد کی جانشینی کا طریقہ رائج ہے جس میں سارا ترکہ بڑے لڑکے کو مل جاتا ہے۔ باقی سب محروم ہو جاتے ہیں۔ پھر بعض مقامات پر اگر مرنے والا چاہے تو کسی دوسرے شخص کے نام اپنے سارے ترکہ کی وصیت کر سکتا ہے۔ اور اس میں اسے مذکر اولاد کو بھی محروم کرنے کا حق ہے۔ اس طریقے کے نتیجہ میں دولت پھیلنے کے بجائے سمٹتی ہے۔ اس کے برعکس ہندو مذہب میں تقسیمِ دولت کو مردوں میں اشتراکی حد تک مساوی کر دیا گیا ہے۔ لیکن عورتیں بہرحال وراثت سے محروم رکھی گئی ہیں، جس سے ان پر ظلم ہونے کے علاوہ گردشِ دولت کا دائرہ اسلام کی بہ نسبت سمٹ جاتا ہے۔

اس کے برخلاف اسلام نے تقسیمِ وراثت کا جو نظام بنایا ہے، اس میں ان تمام خرابیوں کا انسداد ہو جاتا ہے۔ اس نظام کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:-

۱. قرابت کے لحاظ سے وارثوں کی ایک طویل فہرست رکھی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے متروکہ دولت زیادہ وسیع پیمانے پر پھیلتی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ دولت کے وسیع پھیلاؤ کے پیشِ نظر یہ حکم دیا جا سکتا تھا کہ سارا ترکہ غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے یا بیت المال میں داخل کر دیا جائے۔ لیکن اس صورت میں ہر مرنے والا کوشش کرتا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں سارا مال ختم کر جائے اور اس سے معیشت کے نظام میں ابتری پیدا ہو جاتی۔ اس لئے اسلام نے اسے میت کے رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کا نظام بنایا ہے۔

۲. دنیا کے تمام نظام ہائے وراثت کے برخلاف عورتوں کو بھی میراث کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک

عورتوں کیلئے (بھی) ایک حصہ ہے اس مال میں جو والدین اور اقرباء چھوڑ کر جائیں اور عورتوں

الوالدان والاقربون مماقل منہ اوکثر نصیبا مفروضا ۔ (النساء)	کیلئے بھی ایک حصہ ہے اس مال میں جو والدین اور اقارب چھوڑ کر جائیں ۔ تھوڑے میں سے بھی اور زیادہ میں سے بھی ایک معین حصہ ہے۔

۳۔ مرنے والے کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ کسی وارث کو محروم کر دے یا کسی کے حصہ میں ترمیم کر سکے ۔ اس طرح وراثت کے راستے سے ارتکازِ دولت کا امکان ختم کر دیا گیا ہے ۔ ارشاد ہے :

آباءکم وابناءکم لاتدرون ایھم اقرب لکم نفعاً فریضۃ من اللہ	تمہارے باپ بیٹوں میں کون نفع کے اعتبار سے تم سے قریب تر ہے ۔ تم نہیں جانتے یہ اللہ کا مقرر کیا ہوا قانون ہے ۔

۴۔ چھوٹی اور بڑی اولاد میں کوئی تفریق نہیں کی گئی بلکہ سب کو برابر حصہ دیا گیا ۔

۵۔ کسی وارث کے لیئے اس کے حصہ رسدی کے علاوہ کسی مال کی وصیت کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے ۔ اس طرح کوئی وارث متوفی کے مال سے اپنے حصہ وراثت کے سوا کچھ نہیں پا سکتا

۶۔ متوفی کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ وارثوں کے سوا دوسرے لوگوں کیلئے وصیت کر جائیں اس سے بھی دولت کے پھیلاؤ میں مدد ملتی ہے ۔ اور تقسیمِ وراثت سے قبل دولت کا ایک حصہ وصیت پر صرف ہو جاتا ہے ۔

۷۔ لیکن وصیت کرنیوالے کو اس بات کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ پورے مال کی وصیت کر جائے ۔ بلکہ اسے اپنے مال کے صرف ایک تہائی حصہ میں ایسا کرنے کی اجازت دی گئی ہے ۔ اس سے زیادہ کی وصیت کا وہ مجاز نہیں اس طرح ارتکازِ دولت کے اس خطرے کا سد باب کر دیا گیا ہے ، جو پورے مال کی وصیت کی اجازت کی صورت میں پیدا ہو سکتا تھا ۔

خراج وجزیہ : مذکورہ بالا مدات کے علاوہ دو مد ایسے ہیں جن میں مالکان دولت کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے ، کہ وہ اپنی دولت کا کچھ حصہ حکومتِ وقت کو ادا کریں ۔ ایک خراج اور دوسرا جزیہ ــــ

خراج ایک قسم کا زمینی لگان ہے جو صرف ان زمینوں پر عائد کیا جاتا ہے جو فقہی تفصیلات کے مطابق خراجی ہوں اور اسکو حکومت اجتماعی کاموں میں صرف کر سکتی ہے ۔ اور یہ ایک تو ان غیر مسلم افراد سے وصول کیا جاتا ہے ۔ جو اسلامی حکومت کے باشندے ہوں اور حکومت نے ان کے جان مال

اور آبرو کی حفاظت کا ذمہ لیا ہو۔ دوسرے ان غیر مسلم ممالک سے بھی جزیہ وصول کیا جا سکتا ہے جن سے خرید کی ادائیگی پر صلح ہوئی ہو۔ یہ رقم بھی حکومت کے اجتماعی مقاصد میں صرف ہوتی ہے۔

اوپر تقسیم دولت کے جو ثانوی مدات بیان کئے گئے ہیں یہ سب وہ ہیں جن میں دولت صرف کرنا دولت کے اولین مالکوں کے ذمے شخصی طور پر واجب قرار دیا گیا ہے۔ غرباء و مساکین پر اور مسلمانوں کے اجتماعی مقاصد میں خرچ کرنے کی جو ترغیبات قرآن و سنت میں وارد ہوئی ہیں، وہ ان کے علاوہ ہیں۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

يسئلونك ماذا ينفقون — لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں

قل العفو۔ — آپ فرما دیجئے کہ جو بچ رہے۔

اس ارشاد نے واضح فرما دیا ہے کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ انسان صرف مقدار واجب خرچ کرنے پر اکتفاء نہ کرے۔ بلکہ جسقدر دولت اس کی ضرورت سے زائد ہو، وہ سب معاشرے کے ان افراد تک پہنچانے کو اپنی سعادت سمجھے جو دولت سے محروم ہیں۔

قرآنِ کریم اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "انفاق فی سبیل اللہ" کے احکام و فضائل سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان احکام کے ذریعہ اسلام نے تقسیم دولت کا جو خوشگوار نظام قائم فرمایا ہے اس کے نتیجے میں ہماری تاریخ کے اندر ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ معاشرے میں صدقات کو قبول کرنے والا ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا تھا۔

یہ اسلامی نظامِ تقسیم دولت کے چند نمایاں خد و خال تھے۔ اس مختصر مقالے میں اس نظام کی اتنی ہی جھلک دکھائی جا سکتی تھی۔ لیکن امید ہے کہ ان گذارشات سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ اس معاملے میں اسلامی نظامِ معیشت سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے کسطرح ممتاز ہے۔ اور اسکی بنیادی خصوصیات کیا ہیں ——

وما توفيقي الا بالله عليه توكلت واليه انيب

قسط ۲

قرآنِ حکیم اور تعمیرِ اخلاق

(سمیع الحق)

بشکریہ تعلیم القرآن سوسائٹی۔ ڈھاکہ

تعمیرِ اخلاق اور انسانی مجد و شرف کی تکمیل کے سلسلہ میں ان مذاہب کا یہ ایک اجمالی جائزہ تھا۔ اور اس سے واضح ہو گیا کہ ایسے مبہم محرّف، قومی علاقائی نسلی طبقاتی اور غیر فطری اخلاقی ضابطے تعمیرِ انسانیت جیسے نازک ترین کام کی ہرگز صلاحیت نہیں رکھتے۔ اب ہم اس بارہ میں قرآن کریم اور اسلامی تعلیمات کا جائزہ لیتے ہیں۔

قرآنِ کریم اور انسان کے قوتِ علمیہ کی اصلاح | انسان میں خداوند تعالیٰ نے تین بنیادی قوتیں رکھی ہیں جنہیں علمائے اخلاق اور حکمائے اسلام نے تمام اچھے اور بُرے اخلاق کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ قوتِ علم، قوتِ غضب، قوتِ شہوت۔ ان تینوں قوتوں کے اعتدال سے بہترین صفات اور اخلاقِ حسنہ ظاہر ہوتے ہیں۔ پہلی قوت انسان کے علمی فکری اور اعتقادی زندگی اور دوسری و تیسری قوت انسان کی عملی زندگی کا منبع ہے۔ ان باطنی جبلتوں میں سے کسی ایک کا بھی نقطۂ اعتدال سے ہٹ جانا بے شمار اعتقادی اور اخلاقی خرابیوں، ذہنی گمراہیوں اور اعمالِ فاسدہ کا سبب بن جاتا ہے۔ پھر ان تینوں صفات میں قوتِ علمی کی حیثیت اساس اور اصل الاصول کی ہے۔ اور انسان کی دیگر تمام حیوانی صفات کی اعتدال اور بے اعتدالی کا مدار قوتِ علمیہ کے اعتدال ہی پر ہے۔ اس قوت سے انسان کے نظریات اور اعتقادات پھوٹتے ہیں۔ یہی قوت باطنی احساسات، فطرت، ضمیر اور حاسۂ انسانی کو بیدار یا برباد کرتا ہے۔ قوتِ علمیہ کی بے اعتدالی افراط یا تفریط کے نتائج مکر و فریب، جہل، حماقت، ناتجربہ کاری، غلط روی، گمراہی، بدعقیدگی، دیوانگی، تذبذب، تشکیک، بدگمانی، عیاری طراری، غباوت اور بلادت کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ قرآن کریم سب سے پہلے ایمان اسلام اور

توحید کے ذریعہ اس قوت کو اعتدال میں لانا چاہتا ہے جس کے نتیجہ میں انسان اچھے اور برے اقوال افعال، جھوٹ اور سچائی، حق اور باطل کار آمد اور لغو چیزوں میں امتیاز کر سکے۔ حق اور باطل میں تمیز اور تفریق کی اس استعداد کو قرآن کریم حکمت اور فرقان کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ جو اخلاق فاضلہ اور اعتقادات صحیحہ کا سرچشمہ بن کر انسان کے اوپر دین اور دنیا میں خیر کثیر کے دروازے کھول دیتا ہے۔

قرآن کریم نے سب سے پہلے اخلاقی قوتوں کے اس منبع قوت علمیہ کی تصحیح کرنی چاہی اور اپنے جامع اور ہمہ گیر انداز بیان اور اعجازی اسلوب سے علم اور جہل حق اور باطل کے درمیان ایک واضح خط فاصل کھینچ دیا۔ قرآن کریم کے اس حصہ کو ہم "اعتقادات" کے نام سے پہچانتے ہیں۔ اسلام سے پہلے ساری دنیا قوت علمیہ کی بے اعتدالی کی وجہ سے جن اعتقادی خرابیوں میں مبتلا ہو کر اخلاقی انحطاط کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گری تھی۔ قرآن کریم نے اُن تمام مفاسد اور خرابیوں کا معجزانہ انداز میں ازالہ فرمایا۔ سب سے پہلی چیز ایمان و اسلام۔ اور خداوند کریم کی ذات و صفات کے بارہ میں پاکیزہ اور نکھرا ہوا تصور، قرآن حکیم نے توحید خالص پیش کرتے ہوئے خلق و امر اور ساری کائنات کی ربوبیت کا مستحق صرف خداوند کریم کو ٹھہرایا۔ ملائکہ اور انبیاء کی الوہیت کی تردید کی، بت پرستی، ستارہ پرستی، جن اور شیطان، مخفی قوتوں، بھوت، کہانت اور دیگر اوہام و خرافات کی پرستش کا قلع قمع فرمایا۔ تعدد آلہہ کفارہ اور شفاعت کے من گھڑت معانی کا ابطال کیا۔ غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم سے روک دیا۔ خدا اور مخلوق کے درمیانی واسطوں کے مشرکانہ اعتقادات کا ازالہ کیا اور شرک کے تمام شبہات آباء پرستی، قبر پرستی، قوم پرستی، وطن پرستی، اور رنگ و نسل کی پرستش سے بھی انسان کو روک دیا۔ اس کے ساتھ ہی خداوند تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے روشناس کراتے ہوئے جسم و جہت، مادہ اور کثافت کے ہر ظاہری اور باطنی عیوب اور انسانی مزعومات سے اس کی تنزیہ و تقدیس فرمائی۔ انسان کو اس کی صفات جمال و کمال سے آگاہ کیا۔ اس کے علاوہ قرآن نے خالق اور مخلوق کا صحیح مرتبہ بھی متعین کر دیا کہ نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا، نہ کوئی اس کا رشتہ دار ہے اور نہ کوئی اس کا برابر یا ہمسر۔ تعالی اللہ عن ذالک علوا کبیرا قل ھو اللہ احد اللہ الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوا احد۔

ھو اللہ الذی لا الہ الا	اللہ وہ ذات ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں
ھو الملک القدوس السلام	وہ بادشاہ ہے، پاک ذات، سب عیبوں سے

المومن المهيمن العزيز الجبار المتكبر	سالم، امان دینے والا، پناہ میں لینے والا زبردست
سبحان الله عما يشركون هو الله	دباؤ والا صاحب عظمت پاک ہے اللہ ان کے
الخالق البارئ المصور له الاسماء	شریک بتلانے سے وہ اللہ ہے پیدا کرنے والا
الحسنىٰ يسبح له ما في السموات	نکال کھڑا کرنے والا، صورت بنانے والا۔ سب
والارض وهو العزيز الحكيم۔	عمدہ نام اسی کے ہیں پاکی بول رہا ہے اسکی جو

کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے اور وہی زبردست حکمتوں والا ہے۔

ساری کائنات اس کے لئے بحیثیت مخلوق برابر ہے اسکی بارگاہ میں فضیلت اور شرافت کا مدار نہ تو کسی کا مخصوص نسب قوم اور وطن ہے نہ کسی کا خاص رنگ، زبان یا دوسرے دنیاوی امتیازات، اسکی بارگاہ میں بزرگی اور تقرب کی شیئ ہر شخص کے ذاتی اوصاف اور کمالات ہیں۔

ان اكرمكم عند الله اتقاكم۔	بیشک تم میں سے سب سے معزز تم میں سے
...	زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہے۔

ہر شخص اپنے عمل کا خود محاسب ہے، کسی کا عمل، قربانی یا محنت دوسرے کی غفلت اور کوتاہیوں کا کفارہ نہیں بن سکتی۔ ورنہ ایک کے جرم میں دوہرا پکڑا جا سکتا ہے۔

فمن يعمل مثقال ذرة خيرا يره	جس نے ذرہ برابر نیکی یا برائی کی وہ اس کا بدلہ
ومن يعمل مثقال ذرة شرا يره۔	پائے گا۔

اس بارہ میں قرآن کریم صحف اولیٰ اور صحف ابراہیمؑ و موسیٰؑ کے حوالہ سے اس فطری اور سچی بات کو دہراتا ہے جسے ان انبیاءؑ کے پیروؤں نے کفارہ اور ابنیت کے عقیدوں سے بدل دیا تھا۔

ان ليس للانسان الا ما سعىٰ	اٹھاتا نہیں کوئی اٹھانے والا بوجھ کسی دوسرے کا
وان سعيه سوف يرىٰ ثم يجزاه	اور یہ کہ آدمی کو وہی ملتا ہے جو اس نے کمایا اور
الجزاء الاوفىٰ۔	یہ کہ اسکی کمائی اسکو دکھلائی ضرور ہے، پھر اس کو بدلہ
...	ملنا ہے اس کا پورا بدلہ۔

اس کا ارشاد ہے :

انى لا اضيع عمل عامل منكم	بیشک میں تم میں سے کسی مرد اور عورت کی
من ذكر او انثىٰ۔	محنت ضائع نہیں کرتا۔

خداوند عالم، ایمان اور اسلام، خالق اور مخلوق کے باہمی تعلق کے بارہ میں قرآنی تعلیمات کی طرف سے

یہ صرف چند اشارات ہیں جسکی تفصیل سے مختلف اسالیب اور پیرایوں میں پورا قرآن مجید اوّل تا آخر لبریز ہے۔

قرآن کے اخلاقی فلسفے کی روح | قرآن کریم سب سے پہلے توحید ایمان اور اسلام کی شکل میں انسان کے علمی فکری اور نظری قوت کو تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اور پھر اس بنیاد پر اخلاق حسنہ اور اعمال صالحہ کی عمارت اٹھانا چاہتا ہے۔ اور یہی ایمان، تصورِ آخرت، اور عقیدۂ احتساب، اسلام کے اخلاقی فلسفے کی روح ہے جس کے بغیر تمام اخلاقی فلسفے بے جان ڈھانچے ہیں۔ یہ روح اگر تر و تازہ اور توانا ہے تو انسانی فطرت صحیح ضمیر زندہ اور حاسۂ اخلاق بیدار رہے۔ جس کی وجہ سے تمام اعمال و اخلاق فاضلہ اسکی طبیعت اور عادت بن جاتے ہیں اور وہ رذائل اخلاق اور تمام برائیوں سے خود بخود بیزار اور دستبردار ہو جاتا ہے۔ خداوند کریم نے ایمان کی اس اساسی حیثیت کو اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

ولکن اللّٰہ حبّب الیکم الایمان	خداوند تعالیٰ نے ایمان کو تمہارا محبوب اور
وزینہ فی قلوبکم وکرّہ الیکم	پسندیدہ بنایا اور کفر گناہ اور نافرمانی سے
الکفر والفسوق والعصیان	تمہارے دلوں میں نفرت ڈال دی یہی لوگ
اولٰئک ھم الراشدون ۔	نیک چلن ہیں۔

پھر وہ اعمال و اخلاق کی غرض و غایت کسی مادی، وقتی یا فانی منفعت کو نہیں بلکہ خداوند کریم کی خوشنودی رضائے مولیٰ دائمی زندگی، سرخروئی آخرت، حصولِ جنت اور درجاتِ عالیہ کو قرار دیتا ہے ـــــ ـــــ قد افلح من زکھا وقد خاب من دسّھا ۔

اور جگہ جگہ اعمال و اخلاق کی مقبولیت کا دار و مدار ابتغاء مرضات اللّٰہ، ابتغاء وجہ اللّٰہ، ابتغاء وجہ ربّہ الاعلیٰ کو بناتا ہے۔ دنیا کے تمام اخلاقی فلسفے سقراط اور افلاطون اور ارسطو کی اخلاقیات کسی نہ کسی مادی مقاصد اور فوائد پر مبنی تھے۔ اور مادی چیزیں بدلتی رہتی ہیں۔ قرآن کریم نے ایمان کے ذریعہ حسن اخلاق اور اعمال صالحہ کا رشتہ اللّٰہ تعالیٰ کی مرضیات اور نیت خالصہ سے باندھ کر ہر قسم کی مادی آلائشوں اور تمام تغیّر پذیر اثرات سے اسکو پاک و صاف کر دیا۔ اس معاملہ میں وہ طرح طرح کی ترغیب و ترہیب سے کام لے کر ایمان باللّٰہ کے ذریعہ انسان کے اندر سے اس کے ضمیر اور روحانی قوتوں کو بیدار کرتا ہے۔ خوشنودئ مولیٰ کی طلب اور ایمان و اخلاص سے خالی کوئی عمل اس کی بارگاہ میں مقبول نہیں اسکی نگاہ میں ایمان کے بغیر انسان کی کوئی خوبی اخلاقِ فاضلہ

کے زمرے میں نہیں آسکتی۔ مادی منفعت پر مبنی خوش اخلاقی کو درحقیقت نفاق اور خود غرضی سمجھتا ہے۔

والذین کفروا اعمالھم کسراب بقیعۃ	خدا اور آخرت نہ ماننے والوں کے کام ایسے ہیں
یحسبہ الظمآن ماء حتی اذا جاءہ	جیسے میدان میں ریت۔ کہ پیاسا اسکو پانی سمجھ کر وہاں
لم یجدہ شیئا۔ (نور)	جاتا ہے تو وہاں کچھ بھی نہیں پاتا۔

نیکیوں میں دنیاوی مقاصد کی ملاوٹ کو وہ بطلانِ عمل کا باعث سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ اپنے صدقات کو جتلانے سے برباد کرکے ان لوگوں کی طرح مت بوجھ دکھلاوے اور نمود کیلئے مال و دولت خرچ کرتے ہیں۔ اور خدا و آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔[1]

یورپ کے اخلاق کی حقیقت | تصورِ آخرت اور ایمان کے بغیر حسن و اخلاق اور تہذیب و تمدن کی مثال یورپ کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ جہاں تمام اخلاق و اعمال کو صرف مادی نفع نقصان کے ترازو میں تولا جاتا ہے۔ وہاں کی اخلاقیت استحصال زر اور جلبِ منفعت میں محدود ہوکر رہ گئی ہے اور صرف وہی خوبیاں اپنائی جاتی ہیں جو ملک اور سوسائٹی کے لئے مادی لحاظ سے کچھ نہ کچھ فائدہ رکھتی ہوں۔ مثلاً معاملات میں صفائی اور دیانت۔ وعدہ کی پابندی نظم وضبط۔ باہمی تعاون۔ وقت کی پابندی اور حب الوطنی وغیرہ۔ اور جن اخلاقِ حسنہ میں اسے مادی نفع نظر نہیں آتا۔ یورپ اس کے بارہ میں مفلس اور قلاش ہے۔ شرم و حیا عفت اور عصمت، بزرگوں کا ادب، چھوٹوں سے شفقت، کنبہ پروری، رشتہ داروں کے حقوق، انسانیت کا احترام، دوسری قوموں کی پاسداری، خلقِ خدا سے ہمدردی وغیرہ اخلاقِ حسنہ سے تصورِ آخرت اور ایمان نہ ہونے کی وجہ سے یہ اقوام محروم ہیں جن سے ظاہر ہے کہ جو مادی اخلاق وہ اپنائے ہوئے ہیں وہ محض کاروبار اور تجارت اور منفعت پر مبنی ہیں، جو نفاق میں شمار ہوسکتے ہیں۔ مگر اخلاق میں نہیں ___ الغرض کسی قوم فرد یا معاشرہ کا واقعی معنوں میں مہذب ہونے کیلئے لازمی چیز ایمان اور تصورِ آخرت ہے۔ جس کے بغیر تمام عقلی موشگافیاں اور منطقی استدلات اور فلسفیانہ تعلیمات تعمیرِ اخلاقِ انسانی میں ناکام ہیں۔ یہ ایمان و اسلام جس کا قرآن کریم مطالبہ کرتا ہے۔ انسان کا اپنے تمام قویٰ اور صلاحیتوں اور خواہشات کا رب العالمین کو مکمل سپردگی تفویض تمام اور تسلیم کامل کا نام ہے۔ جس کی وجہ سے تمام خواہشات اس کی مرضی میں ڈھل کر رذائل اخلاق کی جڑیں خود بخود کٹ جاتی ہیں۔

---

[1] بقرہ آیت ۲۶

عبادات ایمان اور اعتقاد کے بعد قرآن کریم میں عبادات کا درجہ ہے جو اس ایمان اور عقیدہ کے مظاہر اور علامات ہیں اور قرآن کریم کا اکثر حصہ عبادات بالخصوص ارکان اسلام سے متعلق ہے ۔

قرآن حکیم نے ایمان کے ذریعہ قوت علیمہ کی تطہیر اور اصلاح کرنے کے بعد جو عبادات لازم کیں اور جن پر اسلام کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ یعنی نماز روزہ زکوٰۃ اور حج ان میں سے ہر ایک عبادت اپنے اور بیشمار مصالح کے علاوہ اصلاح اخلاق اور تعمیر سیرت کا وسیع اور ہمہ گیر نظام بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اور ہر رکن عظیم الشان اخلاقی اثرات کا حامل ہے ۔ اور قرآن کریم زندگی بھر ہر روز پانچ مرتبہ نماز کی شکل میں زندگی کے ہر سال کا ایک مہینہ روزہ اور ایک دفعہ زکوٰۃ اور قربانی کی شکل میں اور زندگی میں ایک مرتبہ حج کی شکل میں اخلاقیات کی عملی تربیت دینا چاہتا ہے ۔۔۔ یہاں ہم قرآن پاک کی بعض اساسی عبادات پر اس حیثیت سے قدرے روشنی ڈالتے ہیں۔

نماز اور تعمیر اخلاق نماز جسے اسلام کی اہم ترین اساس اور ایمان وکفر کے درمیان حدفاصل قرار دیا گیا ہے۔ وہ نہ صرف بدن اور جسم کو شائستہ و پاکیزہ بنانے بلکہ باطن کو مہذب بنانے کا بھی ایک جامع نظام ہے ، اس کے حقوق و آداب کی رعایت اور اہمیت کے احساس کے بعد اخلاق نفس درست اور اخلاق رذیلہ کافور ہوجاتے ہیں۔ بیشک صلوٰۃ جس کے مفہوم میں جلانا داخل ہے اخلاق خبیثہ کو جلا دیتی ہے۔ وجہ یہ کہ نفس کی بدخلقی کی بنیاد انانیت اور کبر نفس ہے۔ یہی دو چیزیں بیشمار خرابیوں ، فساد ذات البین ، عجب وغرور ، باہمی جدال و قتال ، قتل و غارت ، بدگوئی اور سب وشتم ، اوروں کی تحقیر و تذلیل ، خود فریبی اور خود ستائی کا ذریعہ بنتی ہیں جنکی وجہ سے پوری دنیا جہنم زار بن جاتی ہے ۔۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ تکبر نفس زبردست پر ظلم وتعدی اور دوسروں سے حسد و عناد ، بدگوئی ، مکاری اور دغا بازی کا باعث بن جاتا ہے۔ جن میں سے ایک حسد بیشمار حریصانہ خصلتوں کی جڑ بن جاتا ہے جس سے غصب و نہب ، ڈکیتی ، سرقہ ، رشوت ، شہوت اور بخل ، طمع اور لالچ پیدا ہونے لگتے ہیں ۔۔۔ نماز جس کے ایک ایک رکن ہر حرکت و ادا اور ایک ایک لفظ سے خداوند تعالیٰ کی عظمت و سطوت اس کے مالکیت و ربوبیت اور متصرف مطلق ہونے کا اقرار و اعتراف نمایاں ہے ۔ قرآن کریم نماز کی شکل میں دن میں پانچ مرتبہ انسانی برائیوں کی اس بنیاد کبر نفس پر تیشہ چلاتا ہے ۔ نمازی اپنے قول و عمل اور تمام حرکات و سکنات کے ذریعہ اعلان کرتا ہے کہ تمام

صفات کمال وجمال اور ہر حمد وستائش کی سزاوار صرف وہ ذات بے ہمتا ہے اور باقی ساری مخلوق عاجز اور محتاج ہے ـــ اس کا ہر ہر عمل عجز وخشوع، تسلیم اور انقیاد، عاجزی اور تفویض کلی کا آئینہ دار ہوتا ہے، وہ اپنی نماز کے ذریعہ اعلان کرتا ہے کہ ترفع اور تکبر، انانیت اور غرور تو ایک طرف میں تو اتنا سراپا احتیاج ہوں کہ انتہائی پستی اور آخری ذلت کیلئے ناک اور پیشانی تک خاک میں رگڑ رہا ہوں۔ پس جبکہ نماز کبرِ نفس کو مٹا کر انسان کو تمام آثار خبیثہ سے پاک وصاف کر دیتی ہے۔ تو فحشاء اور منکر جاہ اور باہ کی بدمستی اور بے اعتدالی۔ قولی اور فکری گناہوں اور اخلاقی گراوٹ کو پھر نفس میں کہاں پناہ مل سکتی ہے۔ قرآن کریم نے نماز کے اس اخلاقیاتی پہلو کو خاص طور سے ذکر فرمایا۔

ان الصلوٰۃ تنھٰی عن الفحشاء والمنکر بیشک نماز بے حیائی اور بری بات سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔

ولذکر اللہ اکبر۔

اور حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

" جسکی نماز اس کو برائی اور بدی سے باز نہ رکھے اسکی نماز نماز ہی نہیں "۔

یہ تو نماز کا سلبی پہلو ہے۔ ایجابی پہلو یہ ہے کہ تزکیہ نفس اور تطہیرِ اخلاق کے ساتھ ساتھ نماز انسان میں وہ اخلاق حمیدہ پیدا کرنا چاہتی ہے جو ایک مہذب انسان کیلئے ضروری ہیں۔ گویا نماز بیک وقت تخلیہ اور تجلیہ دونوں ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہے۔ مثلاً صرف سورۃ فاتحہ کو لیجئے جو نماز کی روح ہے۔ اس کا آغاز ہی الحمد سے ہوتا ہے۔ جو رب العالمین کا شکر اور اس کی عظمتوں کا اعتراف ہے۔ صبر کو لیں تو نماز لذائذ اور خواہشات نفس سے دستکشی ہے۔ اخلاق و احسان کو لیں تو وہ نماز ہی ہے جسے ان تعبد اللہ کانک تراہ اور معراج المومنین کہا گیا ہے۔ سخاوت اور ایثار کو لیں تو نماز ماسوائے خدا کے ساری مخلوق کو قربان کر کے اور تکبیر کو ہاتھ اٹھاتے ہوئے اس سے براءت ظاہر کر دیتا ہے ـــ غرض صدق وعفاف، تسلیم وانقیاد، ضبط وتنظیم، اجتماعیت اور جمعیت خاطر، شوق و ذوق، شجاعت اور قہر نفس، تواضع اور فروتنی، انفاق وایثار کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو اس جامع العبادات وافضل عبادت یعنی نماز میں موجود نہ ہو۔[1]

اس کے علاوہ نماز کا ایک اور اخلاقی پہلو ہے۔ وہ یہ کہ نماز مسلمانوں کو باہمی الفت ومحبت ایک دوسرے کے حالات کی خبر گیری، غم وخوشی میں شرکت جیسے اوصاف سے آراستہ کرتی ہے وہ دن میں پانچ مرتبہ اہل محلہ اور ہفتہ میں ایک بار صلوٰۃ جمعہ کی شکل میں سارے شہر اور سال میں

---

1. ملخصاً از فلسفہ نماز مؤلفہ قاری محمد طیب صاحب صفحہ ۹۲ تا صفحہ ۹۵

دو بار عیدین کی شکل میں دور دراز تک کے دیہات کو اکٹھا کرتی ہے۔ اور باہمی محبت و تعارف اور تعاون و تعاضد کا ذریعہ بنتی ہے۔ ان اجتماعی فوائد ہی کی وجہ سے وہ دیہات میں نماز جمعہ اور صلوٰۃ عیدین کی اجازت نہیں دیتا اور جمعہ بھی شہر کی صرف ایک ہی مسجد جامع میں افضل قرار دیتا ہے۔ نماز کی اس جامع ترین حیثیت کی وجہ سے قرآن کریم نے اسے اپنی اکثر تعلیمات کا محور قرار دیا اور حضرت فاروق اعظمؓ نے اس جامعیت اور ہمہ گیری کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے فرمان جاری کیا کہ :

ان اہمَّ امورِکم عندی الصلوٰۃ	میرے نزدیک تمہارا اہم ترین کام نماز ہے اور جس
فمن ضیّعہا فہولما سواھا اضیع ۔	نے اسے ضائع کیا تو وہ باقی حقوق اور فرائض
...	کو بدرجہ اولیٰ برباد کرنے والا ہوگا۔

حضورؐ نے اسے عماد الدین (دین کا ستون) اور اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا۔ راتوں کا اکثر حصہ اپنے ساتھیوں سمیت نماز میں گزارتے۔ یہاں تک کہ پاؤں پھٹ جاتے اور خون بہہ نکلتا۔

ان ربک یعلم انک تقوم ادنیٰ	بیشک تیرا رب جانتا ہے کہ تو اٹھتا ہے نزدیک
من ثلثی اللیل و نصفہٗ و ثلثہٗ	دو تہائی رات کے اور آدھی رات کے اور تہائی
وطائفۃ من الذین معک ۔	رات کے اور کتنے لوگ تیرے ساتھ کے (شیخ الہند)

اس تفصیل کی روشنی میں بلا کسی تذبذب کہا جا سکتا ہے کہ جو قوم نمازی نہیں وہ کبھی با اخلاق نہیں بن سکتی خواہ وہ کتنی ہی ترقی یافتہ اور متمدن کیوں نہ ہو۔ اسکی ترقی اور تمدن فواحش اور منکرات سے پاک نہ ہوگی۔

روزہ اور تعمیر اخلاق انسان کو ملکوتی قوتوں کے ساتھ حیوانی جبلتیں بھی دی گئی ہیں جو بسا اوقات اخلاقی خرابیوں کا سرچشمہ بن جاتی ہیں۔ قرآن کریم روزہ کے ذریعہ ملکوتی صفات کو قوت بہیمیہ پر غالب کرانا چاہتا ہے اور روزہ کی شکل میں زندگی کے حلال اور طیب لذات سے کنارہ کشی کرا کر انسان کے اندر ضبط نفس، تحمل اور صبر کا مادہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ انسان کی تمام معنوی اور ظاہری صلاحیتیں ایک حیّ و قیوم ذات کی مرضی میں ڈھل جائیں اس وجہ سے قرآن کریم نے روزہ کو تقویٰ کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ لعلکم تتقون اور تقویٰ وہ صفت ہے جس سے آراستہ ہو کر انسان اخلاقیات عالم کا "نسخۂ جامعہ" بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ صرف یہ ایک لفظ تقویٰ اسلام کی تمام تعلیمات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے تقویٰ کی

حقیقت دریافت کی انہوں نے جواب میں فرمایا: اما سلکت طریقاً ذا شوک ...؟ کیا آپ کبھی ایسے راستہ سے نہیں گذرے جہاں کانٹے دار جھاڑیاں ہوں ...؟ فرمایا: ہاں - تو حضرت ابیؓ نے پوچھا کہ پھر آپ نے کیا کیا ...؟ تو آپ نے فرمایا: فشمرت و اجتہدت - میں نے اپنے کپڑے سمیٹ لئے اور اس سے بچتا ہوا گذر گیا - حضرت ابیؓ نے فرمایا کہ خواہشات اور منکرات و لذائذ کی خار دار جھاڑیوں سے بچ بچا کر نکلنا یہی تقویٰ ہے[1] پھر اس لحاظ سے کہ اس میں نفس سے مقابلہ اور مقاومت ہے جو دشمنوں کے مقابلہ سے بھی شدید ہے. حضورؐ نے اسے جہاد اکبر کہا اور جسطرح زکوٰۃ کے ذریعہ مال کا میل کچیل نکل جاتا ہے. روزہ کے ذریعہ جسم کے فاسد مادے اور نفسانی بیماریاں الگ ہو جاتی ہیں- اس لئے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں اسے جسم کی زکوٰۃ[2] کہا گیا ہے، یعنی جسم کو پاک صاف کرنے والی چیز- اور روزہ کے مہینہ کو رمضان کہا گیا یعنی اخلاق فاسدہ اور معاصی و آثار کو جلانے والا مہینہ - پھر اس میں تخلق باخلاق اللہ یعنی خداوند کریم کے اخلاق و صفات کو اپنانے کا پہلو بھی موجود ہے - جو استغنا عن الخلق اور مخلوق سے بے نیازی ہے. اس وجہ سے اس کے اجر و ثواب کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کیطرف منسوب کر دیا ـــــ الا الصوم فانہ لی وانا اجزی بہ - روزہ خالص میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا اجر دوں گا ـــــ گویا اس میں اخلاقِ صمدیت کی جھلک پائی جاتی ہے ـــــ تعمیر سیرت میں حیوانی خواہشات پر کنٹرول کرنے کا بنیادی حصہ ہے. اور یہ صفت صبر سے حاصل ہوتی ہے، جو علماء اخلاق کے نزدیک ایک بنیادی خلق ہے. اور روزہ اس کے حصول کا بہترین ذریعہ - اس واسطے روزے کو حدیث میں نصف صبر اور صبر کو نصف ایمان کہا گیا ہے - اور بناء بر قول مفسرین صابرین سے صائمین ہی مراد ہیں جن کو آیت: انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب میں بے حساب اجر و ثواب کی بشارت دی گئی ہے. پھر اس میں صبر کے علاوہ دوسروں کے ساتھ غمخواری اور ہمدردی فقراء و غرباء کے دکھ درد کا عملی احساس دلانا بھی مطلوب ہے۔ اس لئے حضورؐ نے شہر رمضان کو شہر الصبر والمواساۃ کہا - یعنی صبر اور غمخواری کا مہینہ - اس طرح قرآن کریم نے سال کا پورا مہینہ تعمیر اخلاق اور تہذیب نفس کیلئے مخصوص کر کے رمضان میں صرف ترک اکل و شرب اور جماع سے احتراز کو لازم نہیں کیا. بلکہ ہر اخلاقی برائی، تمام منکرات اور فواحش سے کنارہ کشی کو ضروری قرار دیا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص۴۲ [2] ابن ماجہ

حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

من لم یدع قول الزور والعمل	جس نے برے اعمال و اقوال جھوٹ وغیرہ سے
به فلیس لله حاجة فی ان	احتراز نہ کیا تو اللہ کے ہاں ایسے روزہ کی کوئی
یدع طعامه و شرابه۔	اہمیت نہیں۔

ایک دوسرے ارشاد میں بھی اخلاقی خرابیوں سے سختی سے منع فرمایا۔۔۔۔

اذا کان یوم صوم احدکم فلا یرفث	جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو وہ کوئی بے ہودہ
ولا یصخب فان سابه احد	حرکت نہ کرے، نہ تیزی سے بولے اور نہ لڑائی
او قاتله فلیقل انی صائم۔	جھگڑے کا جواب گالی گلوچ سے دیا کرے۔

ایک اور موقعہ پر حضورؐ نے غیبت کو معطر صوم قرار دیا۔ اور لوگوں کو کھلانے پلانے اور ماتحت مزدور اور مظلوموں پر تخفیف اور آسانی لانے کی تاکید فرمائی۔

زکوٰۃ اور تعمیر اخلاق | محبت مال میں غلو اور افراط کو ہر برائی کی جڑ کہا گیا ہے[1] تاریخ کے ہر دور میں ظلم اور حقوق کی پامالی لوٹ کھسوٹ، جنگ وجدال اور کمزوروں پر غلبہ و استیلاء کے تمام واقعات میں یہی حیوانی جذبہ زیادتِ مال کار فرما رہا ہے۔ اس لئے حضورؐ نے فرمایا حرص یعنی مال کی محبت سے بچو اس حرص نے پہلے لوگوں کو برباد کیا اکثر اخلاقِ فاسدہ، خودغرضی، ناشکری، حسد و عناد، ظلم و فساد، غصب و نہب سرقہ، خالق اور مخلوق دونوں سے بے نیازی، بخل، اسراف وغیرہ اس سے جنم لیتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ افراطِ مال حبِ جاہ اور حبِ باہ کی بنیاد بن جاتا ہے جس کی وجہ سے شہوانی اور غضبانی قوتیں بے اعتدال ہو جاتی ہیں جو بالآخر اخلاقی بربادی کے علاوہ معاشرہ کو اقتصادی اور معاشی بدحالیوں میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ قرآن کریم نے زکوٰۃ کے ذریعہ جس کے مفہوم میں تزکیہ اور پاکیزگی داخل ہے خرابیوں کی اس جڑ (حب مال اور حرص دنیا) کو کاٹ دیا اور مال کو ان خرابیوں کی بجائے ہمدردیٔ خلق، غمخوارگی، رعایت حقوق، احسان و کرم، جود و بخشش، انفاق و ایثار جیسے اخلاقِ حسنہ کا ذریعہ بنا دیا اور زکوٰۃ کے ذریعہ مال و دولت کو ایک طبقہ کی جاگیرداری سے نکال کر معاشرہ کے غریب طبقہ کے دل میں امراء کے ساتھ بجائے حسد، نفرت، بغض اور عداوت کی محبت، انس اور خیرخواہی پیدا کر دی۔ اس بنا پر زکوٰۃ کو صدقہ کہا گیا۔ یعنی تمام سچائیوں کا سرچشمہ اور زکوٰۃ دینے والوں کو متصدقین و متصدقات

---

[1] حب الدنیا راس کل خطیئة۔ (الحدیث)

کہا گیا۔ یعنی قول و فعل اور قلب وعقیدہ کے سچے کیونکہ صدق ان تینوں کی سچائی کا نام ہے۔ خود قرآن کریم نے زکوٰۃ اور صدقہ کو تطہیر نفس اور تزکیہ اخلاق کا نام دیا۔ فرمایا:

خذ من اموالہم صدقۃ تطہرہم
وتزکیہم بہا۔

پھر صدقہ کو صرف زکوٰۃ تک محدود نہیں فرمایا بلکہ اس جذبۂ صدق وصفا کو ابھارنے کے لئے زکوٰۃ کے علاوہ صدقات نافلہ، انفاق فی سبیل اللہ، قربانی، نصف العشر (۱/۲۰) ربع العشر (۱/۴۰) خمس (۱/۵) صدقۃ الفطر، صدقات جاریہ عتق رقبہ، قرض حسنہ، ہبہ، عاریت وغیرہ کی بھی جا بجا تاکید فرمائی ——

ارشاد ہے:

۱۔ وانفقوا فی سبیل اللہ۔ — اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔

۲۔ من ذالذی یقرض اللہ قرضاً حسناً۔ — کون شخص ہے جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض۔

۳۔ یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو۔ ... — وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ تو کہہ دے کہ تمہارے خرچ سے جو بچے۔

۴۔ والذین فی اموالہم حق للسائل والمحروم۔ — اور وہ جن کے مال میں سائل اور محروم کا حق ہے۔

۵۔ لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون۔ — جب تک اپنی پیاری چیز میں سے کچھ نہ خرچ کرو نیکی میں ہرگز کمال نہیں پاسکوگے۔

۶۔ وآت ذالقربی حقہ والمسکین وابن السبیل۔ ... — اور قرابتدار مسکین اور مسافر کو اس کا حق دیا کرو۔

۷۔ وما تنفقوا من خیر یوف الیکم وانتم لا تظلمون۔ — اور جو بھلائی تم نے خدا کی راہ میں کی اس کا پورا پورا بدلہ تمہیں لوٹا دیا جائے گا۔

۸۔ الذین ینفقون اموالہم باللیل والنہار سراً وعلانیۃً فلہم اجرہم عند ربہم ولاخوف علیہم ولاہم یحزنون۔ — جو لوگ اپنے مال کو رات دن ظاہر اور مخفی طور پر خرچ کرتے ہیں۔ اللہ کے ہاں ان کا اجر ہے۔ نہ ان پر ڈر ہوگا۔ نہ کوئی غم اور فکر۔

۹۔ ان اللہ اشتری من المومنین انفسہم واموالہم بان لہم الجنۃ۔ — اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے جنت کے بدلے ان کے مال اور جان خرید چکا ہے۔

۱۰- ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا — اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں خالص اللہ کی رضا
ویتیما واسیرا انما نطعمکم لوجہ اللہ — کے لئے تمہیں کھلاتے ہیں تم سے نہ بدلہ
لا نرید منکم جزاء ولا شکورا۔ — چاہتے ہیں۔ نہ شکریہ۔

مالی اور مادی امداد کے علاوہ باہمی ہمدردی حسن سلوک اور ہر قسم کے مروت اور احسان کو بھی صدقہ کہا گیا۔ حضورؐ نے فرمایا:

مامن مسلم یزرع زرعا او یغرس — جو مسلمان کوئی درخت لگاتے یا کوئی کھیت بوئے
غرسا فیاکل منہ انسان او دابۃ — پھر اس میں سے کوئی انسان یا پرندہ کھاوے
الا کتب لہ بہ صدقۃ۔ — وہ سب اس کیلئے صدقہ ہوگا۔

اس کے علاوہ اپنے اہل وعیال کیلئے کسب حلال اور مزدوری کسی مسلمان بھائی سے خندہ روئی سے ملنا کسی کو نیک بات تبلانے اور کسی کو شر نہ پہنچانے ، کسی کے درمیان صلح اور انصاف کرنے ، کسی کا بوجھ اٹھانے اور تکلیف دینے والی چیز راستہ سے ہٹانے کو بھی صدقہ کہا گیا ہے۔ غرض قرآن کریم انفاق جود وبخشش کو اخلاقی نیکیوں کا گنجینہ قرار دیتا اور مختلف طریقوں سے اسکی ترغیب دیتا ہے۔

آج دنیا کی قومیں معاشی تفاوت میں کچھ تناسب واعتدال پیدا کرنے کیلئے سوشلزم، کمیونزم، کیپٹل ازم اور دوسرے ناموں سے مصروف عمل ہیں۔ مگر اسلام نے صرف ایک رکن زکوٰۃ کے ذریعہ انسان کے طبقاتی تفاوت اور افلاس وتنگدستی یا افراط زر سے پیدا ہونے والی تمام خرابیوں کی اصلاح کرنا چاہی۔ اگر اس نظام زکوٰۃ کو صحیح شکل میں اپنایا جائے تو ان تمام اخلاقی خرابیوں ظلم وغصب حرص وفساد نفرو عزبت گداگری اور عیاشی وغیرہ سب کا قلع قمع ہو سکتا ہے۔

حج اور تعمیر اخلاق عبادات میں حج چوتھا رکن ہے اور دیگر عبادات کی طرح یہ بھی تطہیر اخلاق اور اصلاح نفس کا ایک بہترین نسخہ ہے۔ قرآن کریم حج کے ذریعہ اپنے بندہ کو گھر بار اہل وعیال قوم وقبیلہ ملک ووطن کے تمام تعلقات اور آلائشوں سے جدا کر کے تقدیس وتحمید اور تکبیر وتہلیل کی فضاؤں میں اس کی اخلاقی اور ایمانی تربیت کرنا چاہتا ہے۔ اور اس طرح خویش واقارب، قوم ووطن کی محبت اور کاروبار زندگی میں انہماک سے جو اخلاقی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں حج کی شکل میں ان کا ازالہ کرنا مقصود ہے۔ وہ سراسر مجاہدہ اور ریاضت ہے اور مختلف طبقوں، مختلف قوموں، نسلوں مختلف زبانوں اور رنگتوں کو ایک لباس میں رکھ کر عملی شکل میں مساوات کا درس دینے کی بہترین صورت ہے وہ خدا کے گھر میں ان انواع واقسام کے انسانوں کو جمع کر کے انہیں ایک رشتہ اخوت اور تعلق ایمانی میں

باندھنا چاہتا ہے۔

وہ لوگوں کو دوران سفر کے ذریعہ صبر و تحمل رفقاء کے باہمی حقوق، ضبط نفس اور جفاکشی کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ دنیا کے گوشہ گوشہ سے آئے ہوئے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے حالات سے باخبر ہونے، ایک دوسرے کی بہترین صفات اور اخلاق سیکھنے کا ذریعہ ہے وہ ایک عظیم ڈسپلن، اجتماعی نظم و ضبط کی عملی تربیت ہے۔ اس نے اس سارے سفر میں ہر اس برائی اور منکر سے سختی سے اجتناب کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ جو اس اخلاق اور روحانی مقصد کو نقصان پہنچانے والی ہو۔ وہ گالی گلوچ جھگڑا فساد فحش گوئی اور بے ہودہ حرکات کو منافی حج اعمال میں سے قرار دیتا ہے۔

فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج۔ پس کوئی بے ہودہ فحش گوئی برے اعمال جھگڑا فساد کی گنجائش حج میں نہیں۔

اس کے تمام اعمال عرفات ومنی کے مشاغل خانہ کعبہ کا طواف استلام اور سعی زار وقطار رونا اور حالت احرام میں ناخن اور بال نہ اکھیڑنا جوں تک کو نہ مارنا، کسی جانور کا شکار نہ کرنا اس کے اندر تمام مخلوق سے استغناء، عشق ومحبت سوز و تڑپ اور شیفتگی کے جذبات ابھارتے ہیں۔ اور آقا کے حکم پر سر تسلیم خم کرنا، مخلوق کو دھکم پیل میں ایذا نہ دینا، شیطان اور شیطانی اخلاق سے بیزاری اور برأت کا اظہار ہے۔ حج کا یہ پورا موسم تہذیب نفس اور تربیت اخلاق کا نصاب ہے جسمیں کامیابی پانے والے کو مغفرت اور دخول جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ وہ رذائل اخلاق اور ذنوب وآثام سے اس طرح پاک وصاف ہو جاتا ہے جیسے کہ اس نے آج نیا جنم لیا ہو۔

حضور اقدسؐ نے حج کی اس خوبی پہ روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ حج اور عمرہ دونوں نفسانی آلائشات اور معاصی کو ایسے دور کر دیتے ہیں جیسے بھٹی لوہے یا چاندی کی میل کو دور کر دیتی ہے۔

(باقی آئندہ)

شیخ محمد منصور المجوب

چیف جسٹس لیبیا سے ایک ملاقات

لیبیا افریقہ کا مشہور اسلامی ملک ہے۔ جو مصر اور مراکش کے درمیان واقع ہے، یہاں کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس شیخ محمد منصور المجوب کا نام تو میں نے بار بار سنا تھا، لیکن ان سے پہلی ملاقات ۱۰ ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ کی شام کو چک لالہ ایئرپورٹ کے وی آئی پی روم میں ہوئی۔ یہ راولپنڈی میں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کا پہلا دن تھا، بیشتر ملکی وغیر ملکی مندوبین پہنچ چکے تھے، اور سہ پہر کو تین بجے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے وسیع لان میں کانفرنس کے افتتاح کی رسمی تقریب شروع ہو چکی تھی۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم جو اپنی علالت کی بناء پر ابھی تک پنڈی نہیں پہنچ سکے تھے، شام کو سوا چار بجے کے طیارے سے تشریف لا رہے تھے، میں وقت سے کچھ پہلے چک لالہ کے ہوائی اڈے پر پہنچ گیا، اسی طیارے سے انڈونیشیا کے ایک مندوب پروفیسر ابراہیم حسن بھی تشریف لا رہے تھے۔

ٹھیک سوا چار بجے پی آئی اے کا ٹرائیڈنٹ طیارہ زمین پر اترا اور اس میں سے حضرت والد صاحب مدظلہم اور پروفیسر ابراہیم حسن کے علاوہ مجھے ایک اور پرکشش شخصیت اترتی نظر آئی۔ دراز قد، بھرا ہوا جسم، معصوم اور باوقار چہرہ، سر پر خوبصورت عمامہ کیساتھ سرخ ٹوپی، اور گردن سے ٹخنوں تک اونی جبہ پہنے ہوئے ـــــ جب وہ ذرا قریب آئے تو میں استقبال کیلئے آگے بڑھا انہوں نے مسکرا کر مصافحہ کرتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ "منصور المجوب من لیبیا"

اس سے قبل کانفرنس کے منتظمین نے مجھے یہ بتلایا تھا کہ شیخ منصور المجوب کسی عذر کی وجہ سے

تشریف نہیں لارہے۔ اس لئے اچانک یہ نام سن کر مجھے حیرت کے ساتھ بڑی مسرت ہوئی۔ وی آئی پی روم میں رسمی مراحل طے کرنے کے بعد جب ہم ہوٹل جانے کے لئے گاڑی میں بیٹھے تو انہوں نے بتایا کہ مسلسل سفر کی بنا پر وہ تین راتوں سے سو نہیں سکے اور سخت تھکن کی وجہ سے آج کی مجلس میں شریک ہونا ان کے لئے ممکن نہیں ہے ۔۔۔ چنانچہ ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل پہنچ کر وہ سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے، اور صبح تک کسی پروگرام میں شریک نہیں ہوئے۔

اگلی صبح جب میں کانفرنس ہال جانے کیلئے اپنے کمرے سے نیچے اترا تو وہ لابی میں کھڑے تھے میں نے سلام کے بعد ان سے پوچھا:

فرمایئے، رات کیسی گذری ۔۔۔؟

انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "رات بستر پر لیٹنے کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ اب میں بالکل تازہ دم ہوں"

اس کے بعد ہم باتیں کرتے ہوئے کانفرنس ہال تک آ گئے ۔۔۔ محب محترم مولانا سمیع الحق صاحب مدیر ماہنامہ الحق (اکوڑہ خٹک) بھی موجود تھے۔ ایک بجے کے قریب اجلاس سے فارغ ہو کر ہم دونوں شیخ محجوب کے کمرے میں چلے گئے، کافی دیر تک ان سے مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ بالآخر ہم نے "البلاغ" اور "الحق" کے مختصر تعارف کے بعد ان سے ایک انٹرویو کی فرمائش کر دی۔ اس پر انہوں نے کہا:

"کانفرنس کی مصروفیات تو آپکے سامنے ہیں، آپ ایسا کریں کہ کسی وقت سوالات لکھ کر مجھے دیدیں، مجھے جس وقت بھی مہلت ملے گی، ان کا تحریری جواب پیش کر دوں گا۔"

چنانچہ اسی روز شام کو میں نے کچھ سوالات لکھ کر انہیں پہنچا دیئے۔ لیکن اس کے بعد کے پروگرام اس قدر مسلسل تھے کہ جب تک میں راولپنڈی میں رہا، ان سے بس آتے جاتے علیک سلیک ہوتی رہی اور کسی تفصیلی ملاقات کا موقعہ نہ مل سکا۔

پھر ۱۶ر ذیقعدہ کو جب میں لاہور پہنچا تو جامعہ اشرفیہ کے ایک جلسے میں ان سے پھر ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا:

"میں شرمندہ ہوں کہ آپ کے سوالات کا جواب اب تک نہیں لکھ سکا۔ کل دس بجے کے قریب میں کراچی واپس جا رہا ہوں، آپ اگر صبح ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں مجھے مل لیں تو بڑا اچھا ہو"

میں نے صبح آنے کا وعدہ کر لیا، اور جب اگلی صبح میں ہوٹل پہنچا تو ان کے ہوائی اڈے کیلئے

روانہ ہونے میں تقریباً ایک گھنٹہ باقی تھا۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے سوالات کا پرچہ نکالا، اور مسکرا کر کہنے لگے: "میں اب بھی جوابات لکھ نہیں سکا، اب زبانی ہی کچھ باتیں ہو جائیں۔" اور اسطرح گفتگو شروع ہو گئی، میں نے پوچھا:

"لیبیا میں عدالت، اور قضاء کے نظام کے بارے میں کچھ ارشاد فرمائیے۔؟"

"لیبیا میں دو قسم کی عدالتیں ہوتی ہیں۔" شیخ نے اطمینان کے ساتھ کہنا شروع کیا — ایک شرعی عدالتیں جن میں دینی امور کے فیصلے کئے جاتے ہیں۔ اور دوسری مدنی (سول) عدالتیں جن میں حقوق شہریت سے متعلق مقدمات کی سماعت ہوتی ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی دو دو قسمیں ہیں۔ ابتدائی عدالتیں جن کی طرف ہر مقدمے میں ابتداءً رجوع کیا جاتا ہے۔ اور مرافعہ (WRIT PETITION) کی عدالتیں جن میں ابتدائی عدالت کے فیصلوں پر نظر ثانی کی جاتی ہے۔ پھر ان تمام عدالتوں کے اوپر ایک محکمۂ علیا (سپریم کورٹ) ہے، جس میں شرعی اور مدنی دونوں قسم کے تنازعات کا تصفیہ ہوتا ہے۔ اس محکمۂ علیا کا کام یہ ہے کہ وہ عدالتہائے مرافعہ کے فیصلوں پر نظر ثانی کرتا ہے، انتخابات کے سلسلے میں جسقدر اعتراضات ہوتے ہیں وہی عدالت کے سپرد ہوتے ہیں۔ نیز دستوری تنازعات کا فیصلہ بھی اسی کی ذمہ داری ہے۔ یہ عدالت اپنے مالی اور انتظامی امور میں ایک آزاد ادارہ ہے جو ایک جنرل باڈی کی نگرانی میں کام کرتا ہے۔"

"قاضیوں کے عزل و نصب وغیرہ کا اختیار کس کو ہے۔؟" میں نے پوچھا۔

"قاضیوں کے عزل و نصب اور ترقی و تنزل وغیرہ کے جملہ امور ایک مخصوص جماعت کے سپرد ہیں جو "مجلس اعلیٰ للقضاء" (SUPREME JUDICIAL COUNCIL) کہلاتی ہے۔ محکمۂ علیا کا رئیس القضاۃ (سپریم کورٹ کا چیف جسٹس) اس جماعت کا صدر ہوتا ہے، اور ملک کے بڑے بڑے ماہرین قانون اس کے رکن ہیں — یہ تمام قاضی خواہ کسی قسم یا کسی درجے کی عدالت سے تعلق رکھتے ہوں، اپنے فیصلوں میں قطعی طور پر آزاد ہوتے ہیں، اور قانون کے سوا ان پر کسی کی بالادستی نہیں ہوتی۔"

شیخ محجوب یہاں تک پہنچ کر رک گئے تو میں نے پوچھا:

"لیبیا میں قوانین کا بنیادی مأخذ کیا ہے۔؟"

فرمانے لگے۔ "بعض جزوی قوانین نظر ثانی کے محتاج ہو سکتے ہیں، لیکن لیبیا میں بنیادی طور پر اسلامی شریعت ہی کو مأخذ قانون قرار دیا گیا ہے۔"

سماحۃ الشیخ :" میں نے کہا : " آجکل پوری دنیا جرائم و مظالم کے روز افزوں اضافے سے بُری طرح تنگ آئی ہوئی ہے ، بعض لوگ کہتے ہیں کہ جرائم کا بڑا سبب افلاس ہوتا ہے . لیکن آج دنیا کے خوشحال ترین ممالک میں جرائم کی شرح سب سے زیادہ ہے . قانونی مشنریوں کی کمی یا کمزوری کو جرائم کے اضافے کا سبب قرار دیا جا سکتا تھا . مگر ہماری آنکھوں کے سامنے جتنا اضافہ قانونی مشنریوں میں ہوتا ہے ، اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ جرائم بڑھ جاتے ہیں ، آخر اسکی وجہ کیا ہے . ؟ اس مرض کا کوئی علاج بھی ممکن ہے . ؟ "

میرے اس سوال سے ان کے لبوں پر ایک مغموم مسکراہٹ نمودار ہوئی وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہے ، اس کے بعد انہوں نے رک رک کر بولنا شروع کیا :

" اس سوال کا جواب بڑا طویل ہے . تقی صاحب ! میں سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت انسانیت کی باگ ڈور ہے ، وہ انسان اور خاص طور سے مجرم کی نفسیات کو نہیں سمجھ سکے . انکی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ ذہن کی صحیح تربیت کے بغیر صرف قانونی جکڑبندیوں سے جرائم کا انسداد کرنا چاہتے ہیں ، حالانکہ یہ طریقہ قطعی طور پر غیر فطری ہے . اور اس سے اصلاح احوال کی توقع رکھنا خودفریبی کے سوا کچھ نہیں ."

یہاں پہنچ کر اچانک ان کے لہجے میں بلا کی روانی آگئی ، وہ قدرے جوش کے ساتھ کہنے لگے :

" موجودہ دنیا نے تو مادّہ اور نفسانی خواہشات کو اپنا معبود بنا لیا ہے ، اور اسکی تمام تر سرگرمیاں اسی پہیے کے گرد گھوم رہی ہیں ، انسان کو خوب اچھی طرح یہ سمجھا دیا گیا ہے کہ تیری زندگی کا منتہائے مقصود مادی منافع کا حصول اور نفسانی خواہشات کی تکمیل ہے ، اس کے ذہن سے یہ بات محو کردی گئی ہے . کہ اس دنیا میں چند سال گذارنے کے بعد اسے کہیں اور بھی جانا ہے ، نتیجہ یہ ہے کہ وہ اسی چند روزہ زندگی کو اپنا سب کچھ سمجھتا ہے ، جب اسے جائز طریقوں سے اس زندگی کا عیش میسر نہیں آتا تو وہ اپنے آپ کو محروم سمجھتا ہے . بس یہی احساس محرومی ہے جو اُسے جرم اور گناہ کی طرف لے جاتا ہے . پھر آپ بڑے قانون کے ڈنڈے کے بل پر اُسے ارتکاب جرم سے نہیں روک سکتے تنہائی اور تاریکی میں اسے کسی کا خوف نہیں ہوتا ، اس لئے وہ بڑی آسانی سے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے . پھر جب اسکی خواہشات اور حسرتیں بڑھتی ہیں تو آبادی اور اجالے میں بھی وہ کھلے بندوں قانون سے بغاوت کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے ، اس لئے کہ اسکی نظر میں محرومی اور اسیری دونوں برابر ہیں ."

" پھر آخر اس مسئلے کا کوئی حل بھی ہے . ؟ " میں نے پوچھا .

" اگر ہم رجعت پسندی کے طعنے سے ڈرنا چھوڑ دیں . تو اس کا بڑا اچھا حل ہمارے پاس

موجود ہے۔ اور وہ ہیں اسلامی تعلیمات"۔ انہوں نے کہا۔

"اسلام کی وہ کونسی تعلیمات ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ جو اس مشکل کا حل پیش کرتی ہیں۔؟"

انہوں نے خیالات کو مجتمع کرتے ہوئے جواب دیا،

"دراصل اسلام نے اول تو اس بات کی کوشش کی ہے کہ جرائم خود بخود کم سے کم سرزد ہوں اس کے لئے اس نے قانونی سختیوں کی افراط کرنے سے زیادہ خوف خدا اور عقیدۂ آخرت پر زور دیا ہے۔ سب سے پہلے انسانی ذہن کو اس رُخ پر ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اس دنیوی زندگی ہی کو سب کچھ نہ سمجھے، پیٹ اور مادے ہی کو اپنی زندگی کا مقصد نہ بنائے بلکہ عمل صالح اور آخرت کی بہبود کو اپنا مقصدِ حیات قرار دیکر اسی منزل کی جستجو کرے، غور فرمائیے کہ جب ایک شخص اپنے دل میں یہ یقین پیدا کر لیتا ہے کہ یہ دنیا چند روزہ ہے، اور اس کے بعد ایک ابدی زندگی آنے والی ہے تو اگر اس دنیا میں اسے کچھ تنگی ترشی بھی برداشت کرنی پڑے تب بھی وہ اس تنگی کو رفع کرنے کے لئے اپنی آخرت خراب نہیں کرے گا، اور یہ تنگی ترشی اس کے دل میں وہ محرومی کا احساس پیدا نہیں کرے گی جو میرے نزدیک جرائم کی جڑ ہے ۔۔۔ لہذا اسلام نے سب سے پہلے تو ایسی ذہنیت کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے جو مادی اغراض کے حصول کی بجائے آخرت کی بہبود کو اپنا منتہائے مقصود قرار دے۔ پھر مجموعی طور سے ماحول ایسا پیدا کیا ہے جس میں جرائم کے امکانات کم سے کم ہو جائیں، لیکن ان حفاظتی تدابیر کے بعد بھی اگر کوئی بدباطن شخص جرم سے باز نہ رہ سکے تو پھر اس کے ساتھ کسی رحم کے سلوک کو اس نے گوارا نہیں کیا۔ وہ معاشرے کا سڑا ہوا عضو ہے جسے کاٹنے کیلئے ایسی حدود شرعیہ نافذ کی گئی ہیں، جو ایک مرتبہ جاری ہو جائیں تو سالہا سال تک لوگوں کیلئے عبرت کا سامان بن جائیں۔"

"لیکن بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ حدود شرعیہ اسلام کے ابتدائی دور کیساتھ خاص تھیں، اب ہمارے لئے ان کی پابندی ضروری نہیں رہی۔؟" میں بیچ میں بول اٹھا۔

"ایسا کون کہتا ہے؟" انہوں نے قدرے تعجب سے کہا۔ "قرآن کریم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ وسلم کسی ایک زمانے کیلئے نازل نہیں ہوئے تھے، ان کے مخاطب ہر دور اور ہر زمانے کے لوگ ہیں۔ لہذا قیام قیامت تک ہمارے لئے ان کے تمام تشریعی احکام کی پابندی ضروری ہے اور ان میں شرعی حدود بھی داخل ہیں۔"

"مگر ان کا کہنا یہ ہے کہ سنت سے مراد صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہیں ہے۔

بلکہ ہر زمانے کے مسلمانوں کی سنت بھی اس میں شامل ہے، لہذا اگر کسی زمانے کے مسلمان قانونی احکام کے سلسلے میں کوئی نیا طرزِ عمل اختیار کریں تو وہ بھی "سنت" ہے۔ خواہ وہ پہلے مسلمانوں کی سنت کے خلاف ہو۔" میں نے کہا۔

"میں پہلی بار آپ سے یہ عجیب و غریب بات سن رہا ہوں" انہوں نے کہا۔ "میں تو اتنا جانتا ہوں اور اسی کو پوری امت کا عقیدہ سمجھتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کا بیان فرمودہ طریقۂ زندگی ہمارے دین و دنیا دونوں کے لئے صلاح و فلاح کا ضامن ہے۔ اور یہ طریقہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں قابلِ عمل بلکہ واجب العمل ہے، ہم اس طریقے کی بجائے اپنی طرف سے گھڑ کر جو طریقہ بھی اختیار کریں گے وہ ہمیں ناکامی کی طرف لے جائے گا۔"

شیخ محجوب کی اس بات پر مجھے وہ حضرات یاد آگئے جو یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب کی اندھی تقلید کے بغیر مسلمان کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتے، اس لئے میں نے ایک اور سوال کیا کہ:

"مغربی تہذیب کے ردّ و قبول کے سلسلے میں مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہیئے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "میرے نزدیک مغربی تہذیب کے معاملے میں مسلمانوں کو بڑی احتیاط، بیدار مغزی اور سوجھ بوجھ سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ مغربی تہذیب و تمدن کی جو چیزیں مفید اور اسلامی اصولوں کے مطابق ہوں انہیں ضرور اختیار کیجئے، بلکہ ان میں سے بیشتر چیزیں وہ ہیں جو میرے خیال میں اسلام ہی سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً جذبۂ تحقیق و جستجو، جہد و عمل کا شوق وغیرہ۔ انہی چیزوں کے نتیجے میں انہوں نے جو مفید آلات اور صنعتیں ایجاد کی ہیں ان سے ضرور نفع اٹھانا چاہیئے، لیکن اس کے ساتھ ہی مغربی تہذیب کا ایک نہایت تاریک رُخ بھی ہے، فحاشی و عریانی، رقص و سرود، تصنع اور تکلف، مادہ پرستی یہ تمام وہ چیزیں ہیں جو مغربی تہذیب کے بدترین مظاہر ہیں۔ اور انہوں نے انسانیت کو سخت نقصان پہنچایا ہے، افسوس ہے کہ ہم میں سے بیشتر لوگ اول الذکر چیزوں میں تو مغرب کی مطلق تقلید نہیں کرتے، اور مؤخر الذکر معاملات میں ان سے بھی آگے بڑھ جانے کی فکر میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں فکرِ سلیم عطا فرمائے۔"

"آمین" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اور اتنے میں لیبیا کے سفارت خانے کے لوگ شیخ محجوب کیلئے گاڑی لے کر آگئے۔ انہوں نے مسکرا کر مجھ سے ہاتھ ملائے، معانقہ کیا اور "فی امان اللہ" کہہ کر رخصت ہو گئے۔

★

حضرت مولانا امین الحق صاحب خطیب شیخوپورہ

قسط ـ ۲

رسولِ کریم سے نکاح کے وقت
حضرت عائشہؓ کی عمر

قرآن شریف میں کوئی ایسی نص صریح نہیں ہے جس نے صغر سنی میں نکاح کرنے کو منع فرمایا ہو۔ قرآن شریف کی جس آیت کیطرف عمر احمد عثمانی صاحب اشارہ کرنا چاہتے ہیں اس میں بھی یہ مذکور نہیں ہے کہ بلوغت سے قبل لڑکی یا لڑکے کا نکاح نہ کیا جائے بلکہ ان آیات میں یہ کہا گیا ہے۔ کہ یتیموں کا مال ان کی بلوغت تک ان کے حوالہ نہ کرو اور جب وہ بالغ ہو جائیں اور ان میں مال کی نگرانی اور حفاظت کا سلیقہ بھی موجود ہو تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دو۔ آیات میں یتیموں کو ان کے اموال دیدینے کی بحث ہے۔ اور آزمانے کی حد تبلانے میں اصل مقصود بلوغت کو بیان کرنا ہے۔ اور بلوغت کی شرط قرآن شریف نے نکاح کے جواز کیلئے ذکر نہیں کی بلکہ بلوغت اور رشد کی شرط یتامیٰ کے اموال کو یتامیٰ کے سپرد کر دینے کیلئے ذکر کی گئی ہے۔ اور اس حد کے بیان کرنے میں اس مناسبت سے بلوغت کا ذکر کیا گیا ہے کہ لڑکا ہو یا لڑکی ان میں توالد اور تناسل کی صلاحیت بلوغت کے بعد آتی ہے اور نکاح کی غایت کے پیش نظر نکاح کا معتاد طریقہ یہی ہے کہ لڑکا ہو یا لڑکی ان کے بالغ ہونے کے بعد نکاح کیا جاتا ہے۔ عادت اور معمول میں نکاح کرنا بالغ ہونے کی دلیل اور علامت ہے۔ اور اس معتاد اور معمول طریقہ کے پیش نظر سورۃ نساء کی آیت میں اذا بلغوا النکاح فرمایا گیا ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ آیت نے بلوغ سے پہلے نکاح کرنے کو منع فرمایا ہے۔

قرآن شریف میں بکثرت ایسی مثالیں مذکور ہیں کہ کلام میں شرط اور تعلیق عادت اور معمول پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن اصل حکم پر اس شرط اور تعلیق کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ بلکہ شرط اور تعلیق کے نہ ہونے کی صورت میں بھی جو حکم یا نہی کلام میں مذکور ہے۔ برابر قائم اور مامور بہ ہے۔ مثلاً رہن رکھنے کیلئے

کاتب کا نہ ملنا اور سفر کی شرط مذکور ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر دستاویز لکھنے والا موجود ہے یا سفر کی شرط پوری نہیں ہے تو رہن رکھنا جائز نہیں ہے۔ ارتہان کی مشروعیت کیلئے کاتب کا نہ ملنا اور سفر کی شرط کا پایا جانا ضروری شرط نہیں ہے۔ اگرچہ آیت میں کاتب نہ ملنے کی شرط اور سفر کی تعلیق مذکور ہے۔ مگر معمول اور معتاد طریقہ یہ ہے کہ سفر میں ادھار لینے کی ضرورت پڑجاتی ہے۔ اور کاتب نہیں ملتا۔ اس معمول اور معتاد طریقہ کے پیش نظر قرآن شریف کی آیات میں سفر اور کاتب نہ ملنے کی شرط اور تعلیق مذکور ہے ورنہ ارتہان کی مشروعیت کے حکم پر اس شرط اور تعلیق کے ہونے اور نہ ہونے کا کچھ اثر نہیں ہے۔ اسی طرح سورۃ النساء کی آیت میں بلوغت کی شرط کا صغر سنی کے نفس نکاح کرنے پر کچھ اثر نہیں ہے۔ بلوغت سے پہلے بھی نفس نکاح کیا جائے گا۔ البتہ معتاد اور معمول یہ ہے کہ توالد اور تناسل کا تعلق بلوغت کے بعد ہے۔ اور توالد و تناسل کے اسباب وعلل کی عمر بلوغت ہے کہ بلوغت جماع کی عمر ہے۔ جیساکہ حتی تنکح زوجا غیرہ میں نکاح کے معنی جماع کے ہیں۔۔۔۔

عثمانی صاحب نے سورۃ النساء کی آیت پر پوری توجہ سے غور نہیں کیا ہے۔ ورنہ الیسی راہ نہ چلتے جس پر ان سے پہلے کوئی فقیہہ اور قرآن وحدیث کا بنظر غائر مطالعہ کرنے والا نہیں چلا ہے۔ سورۃ النساء کی آیت میں ایک شرط یہ مذکور ہے۔ کہ یتیم نکاح کی عمر کو پہنچے اور دوسری شرط یہ مذکور ہے کہ اس یتیم میں مال کی حفاظت اور انتظام کا سلیقہ پایا جائے تو اس کا مال اس کے حوالہ کر دو اور یہ دونوں شرطیں جملہ شرطیہ حتیٰ کے بعد مذکور ہیں اور ان دونوں شرطی جملوں کا اس آیت میں صرف ایک جواب مذکور ہے جو ذکر کیا گیا ہے کہ یتیم کو اس کا مال حوالہ کر دو اور پہلے جملہ شرطیہ اذا بلغوا النکاح پر دوسرے جملہ شرطیہ فان انستم منھم رشدا۔ کا حرف فا کے ساتھ عطف ہوا ہے اور عربیت کا یہ ضابطہ ہے کہ حرف فا کے ساتھ جب ایک جملہ شرطیہ کا دوسرے جملہ شرطیہ پر عطف ہوجاتا ہے تو اس کلام میں جو بھی جواب مذکور ہوتا ہے وہ دونوں شرطیہ جملوں کا جواب ہوتا ہے۔

لہذا سورۃ النساء کی آیت کا مفہوم اسطرح ہے کہ جب یتیم نکاح کی عمر (توالد اور تناسل کی مناسب عمر) کو پہنچ جائے اور اس میں اپنے مال کے انتظام کا سلیقہ بھی پایا جائے تو اس کا مال اس کو دے دو۔ سورۃ النساء کی آیت میں کسی طرح بھی یہ مذکور اور مفہوم نہیں ہے کہ جب یتیم بالغ ہوجائے تو اس کا نکاح کرو اور جب اس میں مال کی حفاظت کا سلیقہ پایا جائے تو اس کا مال اسکو

دے دو۔ اگر مقالہ نگار صاحب نے آیت کا یہ مفہوم سمجھانا چاہا ہے کہ جب یتیم بالغ ہو جائے تو اس کا نکاح کرو اور جب اس میں مال کی حفاظت اور انتظام کا سلیقہ پایا جائے تو اس کا مال اسکو دے دو تو قرآن شریف کی ایک آیت میں اپنی طرف سے ایک جواب کا اختراع کرنا اور قرآن شریف میں مذکورہ دو جملوں کے ایک جواب کو الگ الگ جملوں کے الگ الگ دو جوابوں پر تقسیم کرنا اگر تحریف نہیں تو اور کیا ہے۔؟

صحیح سند اور صحیح حدیث | محدثین کی اصطلاح میں متن حدیث کے طریقہ کا نام سند ہے۔ اور اس کو سند اس لئے کہا جاتا ہے کہ محدثین حدیث کی صحت اور ضعف میں سند کی صحت اور ضعف پر اعتماد کرتے ہیں [۱]

سند حدیث کی صحت اور ضعف کیلئے معیار ہے سند سے حدیث پہچانی جاتی ہے کہ وہ صحیح ہے یا ضعیف۔ البتہ جس حدیث کی سند صحیح یا حسن ہے تو جبتک شذوذ اور علت سے اس کا سالم اور محفوظ ہونا یقینی نہ ہو تو ایسی صحیح الاسناد حدیث سے احتجاج نہ کرنا چاہیئے۔ اس لیئے کہ یہ ہو سکتا ہے کہ صحیح السند حدیث میں کچھ علت یا شذوذ ہو، محدثین کسی حدیث کو صحیح الاسناد کہتے ہیں۔ اور کسی حدیث کے بارہ میں یہ کہتے ہیں۔ کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ ہاں کوئی امام حدیث جو اتقان اور تامل میں معتمد ہے اگر وہ کسی حدیث کو صحیح الاسناد کہہ دے اور کوئی علت اس میں ذکر نہ کرے اور نہ اس میں کوئی قدح کرے تو اس کا ظاہر یہ ہے کہ وہ امام اسکی سند کیطرح اس کے متن کو بھی صحیح قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ ابن صلاح نے کہا ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں جب کوئی امام حدیث کسی حدیث کو صحیح کہنے کی بجائے صحیح الاسناد کہدے تو اس عدول کی کوئی وجہ ہونی چاہیئے۔ ائمہ حدیث کے کلام میں اسکی تلاش کرنی چاہیئے کہ کسی امام نے اس حدیث کو صحیح یا حسن کہا ہو تو اس سے احتجاج کیا جائے گا۔ اور اگر کسی امام کے کلام میں اس حدیث کو صحیح یا حسن کہنا ثابت نہیں ہوا تو ایسی حدیث سے احتجاج کرنے میں بڑا خطرہ ہے [۲]

جس حدیث کی سند کو کسی امام حدیث نے صحیح کہا اور اس میں کسی علت اور قدح کا اظہار نہیں کیا ہے۔ تو ابن الصلاحؒ کے حسب ارشاد وہ حدیث صحیح ہے۔ اور بقول حافظ ابن حجرؒ اس کو حدیث صحیح نہ کہنا اور صحیح الاسناد کہنا کسی وجہ سے خالی نہیں ہے۔ ایسی حدیث سے احتجاج

---

[۱] توجیہ النظر ص ۲۵ [۲] ایضاً ص ۱۵۵

کرنے میں متامل نیز اپنے غور و نظر کے مطابق اس حدیث کے صحیح ہونے کا فیصلہ کریگا۔ یہ جمہور محدثین کی رائے ہے۔ ابن الصلاحؒ نے جمہور کی کچھ مخالفت کی ہے مگر یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ محدثین کی یہ تمام بحث ایسی حدیث کے بارہ میں ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مروی نہیں ہے اور نہ ایسے ائمہ حدیث نے اپنی مصنفات میں اسکی تصحیح کی ہے۔ جو مشہور اور معتمد ہیں۔ لیکن جس حدیث کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے۔ تو اس کے صحیح السند ہونے میں جمہور امت کے ساتھ جناب عمر احمد صاحب بھی اتفاق کرتے ہیں۔ مگر بخاریؒ اور مسلمؒ کا التزام یہ ہے کہ وہ اپنی کتابوں میں صحیح احادیث کو روایت کرتے ہیں۔ اور جمہور امت نے صحیح مسلمؒ اور صحیح بخاریؒ کی مروی احادیث کو صحیح تسلیم کیا ہے۔ خود امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کا صحیح حدیث نقل کرنے کا التزام کرتے ہیں۔ اور امت محمدیہ کے اہل علم کا امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے نقل کردہ حدیثوں کی صحت پر اتفاق ہے اور اس کے باوجود کالج کے شعبہ اسلامیات کے صدر محترم عمر احمد صاحب کا بخاریؒ اور مسلمؒ میں حضرت عائشہؓ کی عمر کے بارہ میں مذکورہ حدیث کو سند کے اعتبار سے صحیح تسلیم کرنا اور اس کے متن کے بارہ میں یہ کہنا کہ سند کا صحیح ہونا حدیث کے صحیح ہونے کو مستلزم نہیں ہے۔ بے راہروی اور سمجھ میں نہ آنے والی منطق ہے۔ محدثین نے اگر یہ کہا ہے کہ سند کا صحیح ہونا حدیث کے صحیح ہونے کو مستلزم نہیں ہے تو محدثین کے اس احتیاطی نظریہ کے ساتھ صحیح مسلم اور صحیح بخاری کا استثنا بھی لکھا ہے۔ اس لئے کہ زیادہ سے زیادہ احتیاط کرنے والوں سے امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے صحیح احادیث کو اپنی کتابوں میں روایت کرنے کیلئے اس درجہ اتقان اور احتیاط سے کام لیا ہے جس کے آگے کوئی حد نہیں ہے۔ عثمانی صاحب بہت بڑی غلط فہمی کے شکار ہو رہے ہیں کہ بخاری اور مسلم میں مذکورہ حدیث کی سند کے صحیح ہونے کے ساتھ حدیث کے صحیح ہونے کے استلزام کا انکار کرتے ہیں۔

صحیح حدیث کی تعریف | حافظ ابن الصلاحؒ اپنی کتاب علوم الحدیث میں صحیح حدیث کی تعریف میں لکھتے ہیں۔ "صحیح حدیث وہ ہے جسکی سند متصل ہے۔ اور اول سے آخر تک اس کے تمام رواۃ عادل اور ضابط ہیں اور وہ حدیث شاذ اور معلل نہیں ہے۔ مرسل منقطع شاذ وغیرہ۔ یا جس میں علت قادحہ ہے یا کسی راوی میں ایک گونا جرح ہے صحیح نہیں ہے۔ جس حدیث میں یہ اوصاف موجود ہیں تو اس کے متعلق محدثین کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

علامہ جزائریؒ صحیح حدیث کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ اول سے آخر تک اسکی سند متصل ہے

عادل اور ضابط راوی اپنے جیسے عادل اور ضابط راوی سے روایت کرتا ہے۔ اور اس میں شذوذ اور علت نہیں ہے۔ جس حدیث کی اسناد میں اتصال نہیں ہے۔ یا جس حدیث کی اسناد میں ایسا راوی ہے جس کی عدالت معلوم اور معروف نہیں ہے۔ یا وہ کثیر الخطا ہے۔ اگرچہ وہ صدق اور عدالت میں معروف ہے تو ایسے راوی کی حدیث صحیح نہیں ہے۔ اور جس حدیث میں ارجح راوی کی حدیث کی مخالفت ہے یا جس حدیث میں ایسی علت ہے کہ وہ حدیث کی صحت میں قادح ہے تو ایسی حدیث بھی صحیح نہیں ہے [1]

صحیح حدیث کی تعریف معلوم کر لینے کے بعد آپ سوچئے کہ جس حدیث کے رواۃ مذکورہ صفات سے موصوف ہیں، کیا ایسی صفات سے موصوف رواۃ کی سند سے مذکورہ حدیث کا متن صحیح نہ ہونا چاہئے اور کیا صدر محترم نے حضرت عائشہؓ کی عمر کے بارہ میں بخاری اور مسلم میں مذکورہ حدیث کے متعلق یہ انصاف کیا ہے کہ اسکی سند صحیح ہے۔ مگر اس سے حدیث کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا۔ بخاریؒ اور مسلمؒ نے اپنی احادیث کی اسانید کی طرح اپنی احادیث کے متون کی صحت کا بھی التزام کیا ہے۔ اور ائمہ حدیث نے بخاریؒ اور مسلمؒ کی احادیث کے متون کی صحت پر اتفاق کیا ہے۔ نیز محدثین کا مذکورہ نظریہ کہ سند کا صحیح ہونا متن کے صحیح ہونے کو مستلزم نہیں ہے۔ اس احتیاط کی بنا پر تھا کہ اس حدیث کی سند کے تمام رواۃ عادل اور ضابط ہیں۔ مگر یہ ممکن تھا کہ کسی امام حدیث کو اس حدیث کے شذوذ اور کسی قادح علت پر اطلاع نہ ہوئی ہو۔ مگر امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ جیسے متقن اور وقت نظر کے مالک حضرات نے جب حدیث کو صحیح کہا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس حدیث کے متن میں کسی قسم کا شذوذ اور علت نہیں ہے۔ پھر امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کی روایت کردہ حدیث کی سند کو صحیح ماننا اور اس کے متن کی صحت کا اعتراف نہ کرنا محترم عمر احمد صاحب کی بے انصافی نہیں تو اور کیا ہے۔؟

غرض یہ کہ حضرت عائشہؓ سے چھ سال کی عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح ہونا صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں صحیح اور ثابت ہے اور سند کی طرح حدیث کا متن بھی صحیح ہے۔ ہر قسم کے شذوذ اور علت قادحہ سے سالم اور محفوظ ہے۔ کسی صحیح حدیث اور زیادہ ثقہ رواۃ کی مخالفت اس میں محدثین کی ثابت نہیں ہے۔ صدر محترم عمر احمد صاحب کے اس تفرد پر کہ مذکورہ حدیث قرآن شریف

---

[1] توجیہ النظر ص ۷۹

کی نص صریح کی معارض ہے۔ جتنا بھی تعجب کیا جائے کم ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ باب طبقات کتب الحدیث میں لکھتے ہیں،

"لیکن صحیح بخاری اور صحیح مسلم پس محدثین کو اتفاق ہے کہ ان میں تمام کی تمام متصل مرفوع احادیث یقیناً صحیح ہیں۔ اور یہ دونوں کتابیں اپنے مصنفین تک متواتر پہنچی ہیں اور جو بھی ان کی عظمت نہ کرے اور انکی جلالت اور عظمت میں تساہل کرتا ہے وہ مبتدع بدعتی ہے۔ جو مسلمانوں کی راہ کے خلاف چلتا ہے"۔ ابواسحٰق الاسفرائینی فرماتے ہیں۔ائمہ حدیث کو اس بات پر اتفاق ہے۔ کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث کے اصول اور متون قطعی اور یقینی صحیح ہیں۔[۱]

خبر واحد ظنی ہے عمر احمد صاحب نے بخاری اور مسلم میں مذکورہ حدیث کو پہلے قرآن شریف کا معارض بتلایا اور پھر خبر واحد ظنی کہہ کر اس کے استرداد اور اس کو غلط کہنے کا مطالبہ کیا ہے۔ یہاں خبر واحد کی ظنیت اور قطعیت کی بحث نہیں ہے۔مقصد صرف اس قدر ہے کہ خبر واحد دلیل اور حجت ہے۔ اور اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ جمہور صحابہؓ تابعینؒ اور ان کے بعد کے محدثین اور فقہاء اور اصحاب اصول کا اتفاق ہے کہ خبر واحد ثقہ ثابت شرعی حجج میں سے ایک حجت ہے اور اس پر عمل کرنا لازم ہے۔ حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں۔ میں اہل بدعت کے سوا کسی اہل علم کو نہیں جانتا جس نے راوی کے تفرد کی وجہ سے کسی حدیث کو مسترد کیا ہو بلکہ ائمہ علم اور ان کی راہ چلنے والوں نے متفرد راوی کی حدیث کو لیا ہے۔ اور اس پر عمل کیا ہے۔[۲]

یہ تو تمام کتب حدیث میں مذکورہ خبر واحد کے متعلق اہل علم کا بیان ہے۔ لیکن صدر محترم خبر واحد کی ظنیت کا نظریہ اس حدیث کے متعلق لکھ رہے ہیں۔ جو بخاری اور مسلم میں مذکور ہے۔ مگر بخاری اور مسلم میں مذکورہ خبر واحد کے متعلق ائمہ حدیث کا نظریہ وہ نہیں ہے۔ جو دوسری کتابوں میں خبر واحد کے متعلق ان کا فکر ہے۔ (باقی آئندہ)

۱۔ توجیہ النظر صفحہ ۱۲۵ ۲۔ الحدیث والمحدثون صفحہ ۲۵، صفحہ ۲۶

احوال و کوائف

دارالعلوم حقانیہ

حضرت ضیاء المشائخ مجددی کی آمد ۰ر ذی الحجہ کو افغانستان کے مشہور شیخ طریقت حضرت نورالمشائخ مرحوم کے فرزند اکبر حضرت ضیاء المشائخ فضل عثمان مجددی نقشبندی مدظلہ دارالعلوم تشریف لائے۔ بوجہ تعطیلات عیدالاضحی تعلیمی نظام تو نہ دیکھ سکے مگر حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی معیت میں دارالعلوم کے مختلف انتظامی شعبوں دفاتر، مسجد، کتب خانہ، مطبخ اور تعمیرات کا معائنہ فرماکر نہایت محظوظ ہوئے اور دارالعلوم کی ترقی و استحکام کیلئے دعائیں فرمائیں اور کتاب الآراء میں اپنے تاثرات قلمبند کرائے عصر کی نماز آپ نے مسجد دارالعلوم میں ادا کی اور دور دراز قبائلی علاقوں کے مقیم کافی طلبہ کو ان کی زیارت نصیب ہوئی۔

تعطیلات یکم ذی الحجہ سے دارالعلوم میں عیدالاضحی کی تعطیل ہوئی جو ۱۵ر ذی الحجہ تک جاری رہی اور ۱۶ر ذی الحجہ کو باقاعدہ اسباق شروع ہوئے۔

طلباء دارالعلوم کی علاقائی تفصیل اس سال دارالعلوم کے شعبہ عربی میں پاکستان وغیرہ کے ۴۱۲ طلباء نے داخلہ لیا جن میں سے تقریباً ۱۲۰ طلباء دورہ حدیث میں شریک ہیں۔ ان طلباء کی علاقائی تفصیل درج ذیل ہے۔

پاکستان و ملحقہ ریاستیں					
		چکیسر	۴		
		دیر سٹیٹ	۲۳	نورستان	۲
پشاور	۳۱	سوات	۷	ننگرہار	۱۳
مردان	۴۲	بنیر	۳	غزنی	۸
کوہاٹ	۸	کوہستان	۸	ترکستان	۳
بنوں	۲۲	ہزارہ	۱۹	بدخشاں	۴
ڈیرہ اسماعیل خان	۱۹	باجوڑ	۱۱	لغمان	۲۰
کوئٹہ	۵	میانوالی	۱	گردیز	۱۵
لورالائی	۱۸	کیمبل پور	۳	جلال آباد	۲۰
قلات	۲	مہمند ایجنسی	۶	پغمان	۸
ژوب	۱۰	افغانستان		ہرات	۵
وزیرستان	۱۶	خوست	۱۸	تھائی لینڈ	۱
تیراہ	۵	قندہار	۳۲	کل تعداد	۴۱۲

نتیجہ امتحان سالانہ دورۂ حدیث دارالعلوم حقانیہ

۱۳۸۶ھ (ملحقہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان)

حسب سابق دارالعلوم حقانیہ کے دورۂ احادیث کے امتحانات وفاق المدارس العربیہ ملتان کی نگرانی میں ہوئے پورے وفاق میں شریک ہونے والے طلباء میں سے تقریباً نصف تعداد طلباء دارالعلوم کی تھی۔ مولوی ولی محمد بلوچستانی پورے مغربی پاکستان میں دوئم اور مولوی حبیب گل مردانی سوئم آئے۔ (ادارہ)

نمبر شمار	اسمائے گرامی	نمبر شمار	اسمائے گرامی	نمبر شمار	اسمائے گرامی
	(علیا)	۱۷	مولوی رؤف احمد دیروی	۳۲	مولوی محمد صادق پشاوری
۱	مولوی ولی محمد بلوچستانی	۱۸	〃 غفران اللہ مردانی	۳۳	〃 عبدالمنان ہزاروی
۲	〃 آغا محمد 〃	۱۹	〃 ممتاز احمد 〃	۳۴	〃 مہتاب شاہ 〃
۳	〃 عبدالرؤف قندھاری	۲۰	〃 محمد انوار الحق پشاوری	۳۵	〃 غنی بادشاہ کوہاٹی
۴	〃 سید جمیل خوستی	۲۱	〃 لطف الرحمن کیمبلپوری	۳۶	〃 عبدالوہاب کوہستانی
۵	〃 محمد سالم افغانی	۲۲	〃 سیف الرحمن دیروی	۳۷	〃 حبیب اللہ باجوڑی
۶	〃 عبداللہ بلوچستانی	۲۳	〃 احسان الدین خوستی	۳۸	〃 فضل معبود پشاوری
۷	〃 فضل رازق ہزاروی	۲۴	〃 حبیب گل مردانی	۳۹	〃 عبداللطیف کوہستانی
۸	〃 نور محمد دیروی	۲۵	〃 عبدالغفور افغانی	۴۰	〃 نور نبی 〃
۹	〃 غلام علی بنوی			۴۱	〃 شیر زمان دیروی
۱۰	〃 عزیز الرحمن 〃		(وسطیٰ)	۴۲	〃 محمد حسن بنوی
۱۱	〃 محمد سرور 〃	۲۶	مولوی محمد اسلام افغانی	۴۳	〃 عبداللہ سواتی
۱۲	〃 محمد ظاہر شاہ 〃	۲۷	〃 عبدالرؤف دیروی	۴۴	〃 حبیب الرحمن ہزاروی
۱۳	〃 حبیب الحق دیروی	۲۸	〃 علیب احمد سواتی	۴۵	〃 محمد سعید اللہ دیروی
۱۴	〃 شمس الدین تیراوی	۲۹	〃 محمد شیر خان بنوی	۴۶	〃 شمس التبریز مردانی
۱۵	〃 محمد ظاہر شاہ سواتی	۳۰	〃 عبدالسلام بلوچستانی	۴۷	〃 غوث عالم دیروی
۱۶	〃 فضل علی دیروی	۳۱	〃 معروف الدین خوستی	۴۸	〃 قاضی محمد مبارک سواتی

نمبر شمار	اسمائے گرامی	نمبر شمار	اسمائے گرامی	نمبر شمار	اسمائے گرامی
	(وسطیٰ)	۷۰	مولوی عبدالواحد قندہاری		مندرجہ ذیل طلباء کو بخاری شریف میں دوبارہ امتحان دینا ہوگا۔
		۷۱	" عبدالکریم بلوچستانی		
۴۹	مولوی محمد عبدالغفور ہزاروی	۷۲	" نیاز محمد پشاوری	۱	مولوی جہاں نور دیروی
۵۰	" محمد سلیم کوہاٹی	۷۳	" اللہ نور افغانی	۲	" بدرالدجیٰ ہزاروی
۵۱	" محمد عمر افغانی	۷۴	" عبدالرب کوہاٹی	۳	" خلیل الرحمٰن "
۵۲	" حبیب شاہ مردانی	۷۵	" محمد عالم خان افغانی	۴	" مطیع الحق مردانی
۵۳	" محمد حسن دیروی	۷۶	" محمود مسعودی۔ مسعودی	۵	" گل کریم افغانی
۵۴	" تاج محمد پشاوری	۷۷	" محمد نور گل ڈیروی	۶	" محمد شفیق پشاوری
۵۵	" عبدالرحیم افغانی	۷۸	" محمد شفیق مردانی	۷	" محمد عالم بنوی
۵۶	" فیض الرحمٰن مردانی	۷۹	" گل محمد افغانی	۸	" عبدالرشید ترکستانی
۵۷	" محمد حنیف افغانی	۸۰	" فضل سبحان مردانی		مندرجہ ذیل طلباء امتحان میں کامیاب نہیں ہوسکے
۵۸	" نعیم اللہ دیروی	۸۱	" باز محمد "		
۵۹	" عبدالحق صادق پشاوری	۸۲	" محمد صدیق ڈیروی	۱	مولوی خواجہ محمد وزیرستانی
۶۰	" خدائی نور افغانی	۸۳	" عبیدالرحمٰن دیروی	۲	" محمد عارف دیروی
۶۱	" زین العابدین پشاوری	۸۴	" انار گل افغانی	۳	" محمد ابراہیم افغانی
	(ادنیٰ)	۸۵	" سعید جان مہمندی	۴	" فتح الرحمٰن دیروی
		۸۶	" عبدالغفور افغانی	۵	" غلام داؤد دیروی
۶۲	مولوی اللہ داد قندہاری	۸۷	" رحمت اللہ وزیرستانی	۶	" عالمین گل کوہاٹی
۶۳	" فاتح محمد دیروی	۸۸	" شیر زمان دیروی	۷	" دین محمد افغانی
۶۴	" عبدالمنان افغانی	۸۹	" عبدالحمید "	۸	" عبدالواسع ہزاروی
۶۵	" محمد رفیق سواتی	۹۰	" میاں ولی جان باجوڑی	۹	" محمد مسکین "
۶۶	" بدرالدین بلوچستانی	۹۱	" عبدالحی افغانی	۱۰	" زر بادشاہ کوہاٹی
۶۷	" محمد رسول پشاوری	۹۲	" عبدالمجید مردانی	۱۱	" باز محمد افغانی
۶۸	" عبدالہادی کوہاٹی	۹۳	" محمد داؤد پشاوری	۱۲	" مختار احمد مردانی
۶۹	" امیر زاہد سواتی				